www.alrisala.org

الرسالہ

Al-Risala

September 2001 • No. 298

وقت کے استعمال کا بجٹ بنایئے، جس طرح
آپ اپنی آمدنی اور خرچ کا بجٹ بناتے ہیں۔

فہرست

بے اعترافی سے سرکشی تک	4
ایمان کا کرشمہ	6
جذبۂ شکر کی حفاظت	8
غیر حکیمانہ اسلوب	10
صدقہ کلچر	11
آفاقی آواز	12
شکر یا سرکشی	13
نماز کی پہچان	14
جاننے کی بات	15
تجزیاتی اسلوب، شاعرانہ اسلوب	16
دشمن اور مُقاتِل کا فرق	17
بامقصد زندگی نہ کہ پر راحت زندگی	18
تالیفِ قلب	21
جہاد کا تصور اسلام میں	25
سوال و جواب	36
ایک خط	45

بے اعترافی سے سرکشی تک

عربی کا ایک مثل ہے: اتق شر من احسنت الیہ (اس آدمی کے شر سے بچو جس کے اوپر تم نے احسان کیا ہے۔ یہی بات ایک عربی شاعر نے مزید اضافہ کے ساتھ اس طرح کہی ہے ـــــ اگر تم شریف آدمی کے ساتھ احسان کرو تو تم اس کو اپنا بنا لو گے، اگر تم کمینہ آدمی کے ساتھ احسان کرو تو وہ سرکشی کرے گا:

اذا أنت اکرمت الکریم ملکتہ اذا أنت اکرمت اللئیم تمرّدِ

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی شخص کے ساتھ احسان کا معاملہ کیا جائے تو جلد ہی وہ اپنے محسن کا مخالف بن جاتا ہے۔ وہ اپنے محسن کو بدنام کرنے کی مہم چلاتا ہے۔ وہ عیب جوئی اور الزام تراشی کے ذریعہ ثابت کرتا ہے کہ اس کا محسن ایک انتہائی برا آدمی ہے۔ ایسے کردار کا تجربہ ماضی میں بھی بار بار لوگوں کو ہوا اور آج بھی ایسے کردار کی مثالیں ہر جگہ دکھائی دیتی ہیں۔

ایسا کیوں ہے۔ آدمی کیوں ایسا کرتا ہے کہ وہ اپنے محسن کے خلاف کردار کشی کی مہم چلاتا ہے۔ یہ درحقیقت وہی چیز ہے جس کو پردہ ڈالنے کی تدبیر (cover up tactics) کہا جاتا ہے۔ جو آدمی بے اعترافی کی نفسیات میں جی رہا ہو وہ عین اپنے مزاج کے مطابق یہ چاہنے لگتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ ثابت کرے کہ اس کے اوپر کسی کا احسان نہیں ہے، اس نے جو کچھ پایا ہے خود اپنی ذاتی لیاقت کے ذریعہ پایا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی اور کے دینے سے اس کو مل گیا ہے۔

اسی نفسیات کا یہ نتیجہ ہے کہ ایسا آدمی اپنے محسن کو برا ثابت کرنے کی مہم چلا دیتا ہے۔ وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کا محسن ہر قسم کی برائیوں کا مجموعہ ہے۔ اس طرح وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ اس کا محسن اس قابل ہی نہیں کہ وہ کوئی اچھا کام کرے، پھر وہ میرے ساتھ کہاں سے احسان کا معاملہ کرے گا۔

اپنے محسن کے خلاف عیب زنی کی مہم چلانا دراصل اپنی کمی کو چھپانے کی ایک کوشش ہے۔ آدمی

اگر اپنے محسن کا اعتراف کرے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ میرا قد محسن کے مقابلہ میں چھوٹا ہو گیا۔ اس لئے وہ محسن کے قد کو چھوٹا کرنے کی کوشش کرتا ہے تا کہ اس کے اپنے قد کی مفروضہ بڑائی باقی رہے۔

محسن کے احسان کا اعتراف کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ عظیم خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ آدمی جب اپنے محسن کا اعتراف کرتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر تواضع (modesty) کی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور تواضع کی صفت بلاشبہہ تمام انسانی خوبیوں کا سرچشمہ ہے، خواہ اس کا تعلق بندوں سے ہو یا خدا سے۔ اس کے برعکس جب آدمی اپنے محسن کے احسان کا اعتراف نہ کرے تو اس کے نتیجہ میں اس کے اندر گھمنڈ (arrogance) کی نفسیات جاگتی ہے۔ وہ غرور کی نفسیات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور غرور کی نفسیات بلاشبہہ تمام انسانی برائیوں میں سب سے زیادہ تباہ کن برائی ہے۔ اس قسم کی نفسیات آدمی کو آخری حد تک خدا پرستانہ زندگی سے دور کر دیتی ہے۔

اس معاملہ کا سب سے زیادہ المناک پہلو یہ ہے کہ جو آدمی اپنے محسن کا احسان نہ مانے وہ خود اپنا نقصان کرتا ہے۔ وہ اپنے اندر احسان مندی کی نفسیات کا خاتمہ کر رہا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو اِس سب سے بڑی عبادت کے لئے نا اہل بنا رہا ہے کہ وہ اپنے خالق کا احسان مانے۔ وہ اپنے خالق کے انعامات کا اعتراف کر کے اس کی ابدی رحمتوں کا مستحق بن جائے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص انسان کا احسان نہ مانے وہ اللہ کا احسان بھی نہیں مانے گا (**من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ**)۔

احسان مندی ایک انتہائی شریف انسانی جذبہ ہے۔ جو آدمی اپنے محسن کا احسان نہیں مانتا وہ گویا اپنے سینہ کے اندر اس شریف ترین جذبہ کی پرورش کا دروازہ بند کر رہا ہے۔ دوسرے کو ہلاک کرنے کی ناکام کوشش میں وہ خود اپنے آپ کو ہلاک کر رہا ہے۔ یقیناً اس سے زیادہ بڑی محرومی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ دوسرے کو ہلاک کرنے کی ناکام کوشش میں آدمی خود اپنے آپ کو ہلاک کر لے۔

ایمان کا کرشمہ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص توبہ کرے اور ایمان لائے اور عمل صالح کرے تو اللہ ایسے لوگوں کی سیئات کو حسنات سے بدل دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (الفرقان ۷۰)

اس آیت کو سمجھنے کے لیے قرآنی اسلوب کو جاننا بہت ضروری ہے۔ قرآن کی اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ اگرچہ متعدی کے صیغہ میں ہے مگر اس سے مراد لازم کا صیغہ ہے۔ یعنی اس سے مراد توفیق الٰہی ہے نہ کہ لفظی معنوں میں حکم الٰہی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک شخص سچائی کو دریافت کرتا ہے، جب اس کا طرز فکر ربانی طرز فکر بن جاتا ہے۔ جب اس کے اعمال اللہ کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں تو اس کے اندر احساس اور شعور کی ایک نئی شخصیت ظہور میں آتی ہے۔ اس کے اندر ایک نیا ایمانی مزاج پرورش پاتا ہے۔ اسی ایمانی مزاج کے تحت یہ کرشمہ وقوع میں آتا ہے کہ بظاہر ایک برائی اس کے لئے نیکی میں تبدیل ہو جائے۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے ایک واقعاتی مثال لیجئے۔ میرٹھ کے محمد ساجد خاں صاحب الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ اللہ کی توفیق سے ان کے اندر گہرا دینی مزاج پیدا ہو چکا ہے۔ ایک دن وہ اپنے کاروبار میں مشغول تھے۔ ایک معاملہ میں ان کو اپنے ایک کارکن پر سخت غصہ آ گیا۔ اس وقت ان کو قرآن کی یہ آیت یاد آئی: واذا ما غضبوا هم يغفرون (الشوریٰ ۳۷) انہوں نے غصہ کو ضبط کر لیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اٹھ کر قریب کی مسجد میں گئے۔ وہاں انہوں نے وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھی اور دعا کی۔ وہ جب دوبارہ اپنے دفتر میں واپس آئے تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اب وہ ایک نارمل انسان بن چکے تھے جیسا کہ وہ پہلے تھے۔ اس واقعہ کو جب میں نے سنا تو میں نے کہا کہ آپ نے غصہ کو عبادت میں تبدیل کر دیا۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ برائی کا نیکی میں تبدیل ہو جانا کیا ہے۔ یہ انوکھا واقعہ کس طرح ایک بندۂ مومن کی زندگی میں پیش آتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایمان ایک اعلیٰ ترین شعوری واقعہ

ہے۔جس آدمی کواللہ کی توفیق سے ایمان حاصل ہواس کی نفسیاتی شخصیت اوراس کا پورا فکری وجود بدل جاتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ ہر معاملہ کواللہ کی نظر سے دیکھے، ہر معاملہ کو آخرت کی سوچ میں ڈھال لے۔

ایسا آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ منفی صورت حال کا بھی مثبت جواب (positive response) دے۔ وہ انسانی تجربہ میں بھی اللہ کو یاد کرنے لگے۔ وہ اپنے مادی نقصان میں بھی روحانی یافت کا تجربہ کرے۔ اس سے اگر کوئی غلطی ہو جائے تو یہ غلطی اس کے اندر خود احتسابی کا جذبہ پیدا کر کے اس کو اور زیادہ نیکی کی طرف مائل کر دے۔

ایمان کے ذریعہ بننے والے یہی وہ خاص انسان ہیں جن کواللہ کی خصوصی مدد سے یہ توفیق ملتی ہے کہ ان کی برائیاں بھی نیکیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ان کی شخصیت گویا ایک ایسا سانچہ (mould) بن جاتی ہے جس میں داخل ہونے والی ہر چیز ربانی نمونہ میں ڈھل جائے، خواہ ابتدائی طور پر بظاہر وہ غیر ربانی دکھائی دیتی ہو۔

سیئات کا حسنات بن جانا دراصل تغیر (conversion) کا ایک عمل ہے، یہ ویسا ہی ہے جیسے دودھ دینے والے ایک جانور کے اندر غیر دودھ (non-milk) داخل ہوتا ہے اور وہ دودھ (milk) بن کر باہر آتا ہے۔ جانور کے اندر یہ واقعہ ایک فطری عمل (natural process) کے تحت ہوتا ہے۔ اور ربانی انسان کے اندر اس قسم کا واقعہ ایک ذہنی عمل (intellectual process) کے تحت پیش آتا ہے۔ مومن کا ترقی یافتہ شعور اس کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ خارجی حالات سے متاثر ہوئے بغیر خود اپنے آزاد ذہن کے تحت سوچے، وہ ردّ عمل کی نفسیات میں مبتلا ہوئے بغیر اعلیٰ انسانیت پر قائم رہے۔ ندامت کے آنسو اس کی برائی کو بھی اس کے اعمال نامہ میں نیکی کے عنوان کے تحت درج کر دیں۔

جذبۂ شکر کی حفاظت

رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد حدیث کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔ **البخاری (کتاب الرقاق)، مسلم (کتاب الزھد)، الترمذی (کتاب اللباس)، ابن ماجه (کتاب الزھد)، مسند احمد،** وغیرہ۔ مسند احمد کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: **انظروا الی من ھو أسفل منکم ولا تنظروا الی من ھو فوقکم فانه أجدر أن لا تزدروا نعمة الله علیکم** (تم اس کو دیکھو جو تم سے نیچے ہے اور تم اس کو نہ دیکھو جو تم سے اوپر ہے، کیوں کہ اس طرح تم اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو کم نہیں سمجھو گے)۔

اس حدیث کی مزید تشریح ایک اور حدیث سے ہوتی ہے۔ ایک مرفوع روایت کے مطابق، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **خصلتان من کانتا فیه کتبه الله شاکرا صابراً، من نظر فی دنیاه الی من ھو دونه فحمد الله علی ما فضله به علیه، ومن نظر فی دینه إلی من ھو فوقه فاقتدیٰ به۔ وأما من نظر فی دنیاه إلی من ھو فوقه فأسف علی ما فاته فإنه لا یکتب شاکرا و لا صابرا** (فتح الباری ۱۱/ ۳۳۰)۔ یعنی دو صفتیں ہیں جو کسی کے اندر ہوں تو اللہ اس کو شاکر اور صابر لکھ دیتا ہے۔ جو دنیا کے معاملہ میں اس کو دیکھے جو اس سے کم ہے پھر وہ اللہ کا شکر کرے اس نعمت پر جو اللہ نے اسے دی ہے۔ اور جو اپنے دین کے معاملہ میں اس کو دیکھے جو اس کے اوپر ہے پھر وہ اس کی پیروی کرے۔ مگر جو اپنی دنیا کے معاملہ میں اس کو دیکھے جو اس کے اوپر ہے پھر وہ اس پر افسوس کرے جو اس سے کھو یا گیا تو وہ نہ شاکر لکھا جائے گا اور نہ صابر لکھا جائے گا۔

شکر سب سے بڑی عبادت ہے۔ کسی بندے سے جو چیز سب سے زیادہ مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ کو ایک عظیم منعم کے طور پر دریافت کرے۔ اللہ کی نعمتوں کے احساس سے اس کا سینہ بھرا ہوا ہو۔ اس کی روح میں شکر کا ابدی چشمہ جاری ہو جائے۔ وہ اللہ کو ایک ایسی ہستی کے طور پر پائے جو اس پر بے پایاں نعمتوں کی بارش کر رہا ہے۔ یہ شعور اتنا زیادہ قوی ہو کہ کسی بھی حال میں اس کا سینہ شکر خداوندی کے احساس سے خالی نہ ہو۔

مگر یہ کوئی آسان بات نہیں۔ اپنے آپ کو شکر کے جذبہ سے سرشار رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی کا شعور اس معاملہ میں پوری طرح زندہ ہو۔ وہ اس کا مسلسل اہتمام کرے۔ وہ کسی ایسے خیال کو اپنے دل میں جگہ نہ دے جو اس کے جذبہ شکر کو مجروح کرنے والا ہو۔ وہ سب کچھ برداشت کرلے مگر وہ اپنے جذبہ شکر کا کٹاؤ (erosion) کبھی برداشت نہ کرے۔

موجودہ دنیا میں فطری طور پر ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان نابرابری قائم رہتی ہے۔ اس بنا پر ہر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ مادی اعتبار سے کوئی اس سے کم ہے اور کوئی اس سے زیادہ۔ اب اگر آدمی اپنا مقابلہ اس شخص سے کرے جو بظاہر اس سے زیادہ ہے تو اس کے اندر کمتری کا احساس پیدا ہوگا اور اس کا جذبہ شکر دب کر رہ جائے گا۔ اس لیے آدمی کو ایسا کبھی نہیں کرنا چاہئے کہ وہ اپنا موازنہ اس سے کرے جو مادی اعتبار سے بظاہر اس سے زیادہ ہے۔ اس کے بجائے آدمی کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ اپنا موازنہ ان لوگوں سے کرے جو مادی اعتبار سے اس سے کم ہیں۔ اس طرح اس کا جذبہ شکر زندہ رہے گا۔ اس کا دل کبھی نعمت کے احساس سے خالی نہ ہو سکے گا۔

موجودہ دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ تمام لوگ مادی اعتبار سے یکساں نہیں ہوتے۔ کوئی زیادہ ہوتا ہے اور کوئی کم، کوئی پیچھے ہوتا ہے اور کوئی آگے، کوئی طاقت ور ہوتا ہے اور کوئی کمزور۔ اس قسم کے تمام فرق امتحان کی مصلحت کی بنا پر ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ آدمی مختلف قسم کے حالات سے گزرے، مگر وہ حالات سے متاثر ہوئے بغیر اپنے ایمانی شعور کو زندہ رکھے۔

وہ ناشکری والے حالات سے دوچار ہو، پھر بھی اس کے شکر کے جذبہ میں کوئی کمی نہ آئے۔ وہ بے اعترافی کی صورت حال سے گذرے، مگر وہ اپنے اعتراف کی صفت کو نہ کھوئے۔ وہ منفی جذبات پیدا کرنے والے حالات سے دوچار ہو، اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو مثبت طرز فکر پر قائم رکھے۔ شکر وہ سب سے قیمتی متاع ہے جس کو انسان اپنے رب کے سامنے پیش کرسکتا ہے۔ ایسی حالت میں عقل مند انسان وہ ہے جو اپنے سینہ کو شکر کے احساس سے خالی نہ ہونے دے، حتی کہ انتہائی غیر موافق صورت حال میں بھی۔

غیر حکیمانہ اسلوب

پاکستان کے سابق وزیر اعظم محمد نواز شریف جلاوطنی کے بعد سعودی عرب میں ہیں۔ ریاض سے نکلنے والے ہفتہ وار عربی اخبار 'العالم الإسلامی' کے شمارہ ۲۴ صفر ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۸ مئی ۲۰۰۱ء میں اُن کا ایک انٹرویو چھپا ہے۔ مسٹر نواز شریف نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ہاں، اسلام اور اہل اسلام کے خلاف عالمی دشمنی موجود ہے (**نعم هناک عداء عالمی للإسلام و أهله**)۔ پھر اسی انٹرویو میں نواز شریف صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں داخلی کمیاں ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہم پہلے خود اپنا محاسبہ کریں اس سے پہلے کہ ہم دوسروں کو الزام دیں (**أری أن نحاسب أنفسنا قبل أن نتهم الآخرین**)۔

موجودہ زمانہ کے اکثر لکھنے والے اور بولنے والے لوگ مسلمانوں کو اسی قسم کی دوطرفہ نصیحت کرتے ہیں۔ ایک طرف وہ مسلمانوں کو یہ خبر دیں گے کہ دوسری قومیں ان کی دشمن ہوگئی ہیں اور دوسری طرف وہ مسلمانوں سے کہیں گے کہ تم لوگ اپنی داخلی کمیوں کو دور کرو۔ اس قسم کی نصیحت سراسر غیر مفید ہے۔ جب مسلمانوں کو یہ بتایا جائے کہ تمہارے خلاف ساری دنیا میں دشمنی اور سازش کا ماحول بنا ہوا ہے تو ایسی حالت میں مسلمانوں کے اندر جو چیز پیدا ہوگی وہ غصہ اور نفرت ہے نہ کہ مثبت عمل کا جذبہ۔ کلام کا یہ انداز آدمی کو یہ احساس دلاتا ہے کہ تم مسائل سے گھرے ہوئے ہو، جب کہ صحیح انداز کلام وہ ہے جو آدمی کے سامنے مواقع کار کی نشاندہی کرے۔

نصیحت کا صحیح اور فطری طریقہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ بتایا جائے کہ جس چیز کو تم دشمنی سمجھ رہے ہو وہ فطری مسابقت ہے۔ اس قسم کی مسابقت اور چیلنج ہمیشہ دنیا میں رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ہم کو چاہئے کہ اس ''دشمنی'' کو فطرت کا قانون سمجھ کر اس کو قبول کریں اور محنت اور دانش مندی کے ذریعہ اپنے مستقبل کی تعمیر کریں۔ تعمیری عمل ہمیشہ تعمیری جذبہ کے تحت کیا جاتا ہے، منفی جذبہ کے تحت کبھی کوئی تعمیری عمل انجام نہیں پاتا۔

صدقہ کلچر

ایمان آدمی کے اندر جونفسیات پیدا کرتا ہے اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ ایسے آدمی کے اندر دینے کا جذبہ بے پناہ حد تک پیدا ہوجاتا ہے وہ ہر لمحہ دوسروں کو دینے کے لئے آمادہ رہتا ہے، خواہ اس کو دوسروں سے مل رہا ہو یا نہ مل رہا ہو۔

اس سلسلہ میں ایک حدیث وہ ہے جو الترمذی اور ابو داؤد نے نقل کی ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ مدینہ کی مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باجماعت نماز ادا کی۔ نماز سے فراغت کے بعد ابھی لوگ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص وہاں آیا۔ چونکہ جماعت ختم ہوچکی تھی، وہ الگ کھڑا ہوکر اپنی نماز پڑھنے لگا۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم میں سے کوئی شخص ہے جو اس آدمی کے اوپر صدقہ کرے اور وہ اس کے ساتھ نماز پڑھے (ألا رجل يتصدق على هذا فيصلي معه) پھر ایک صاحب (ابوبکر صدیق) اٹھے اور انہوں نے اس آدمی کے ساتھ نماز ادا کی (مشكاة المصابيح ۱/۳۶۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کا مقتدی بن کر اس کے ساتھ نماز پڑھنے کو اس کے لئے صدقہ کیوں فرمایا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ آدمی جماعت سے محروم رہ گیا تھا اور اب وہ جماعت کے بغیر اپنی نماز ادا کر رہا تھا۔ ایسی حالت میں اگر ایک شخص اس کے ساتھ بطور مقتدی شریکِ نماز ہوجائے تو اس کی نماز ایک باجماعت نماز بن جائے گی۔ اس طرح یہ شریک ہونے والا آدمی مذکورہ نمازی کو باجماعت نماز کا ثواب دینے کا ذریعہ بن جائے گا۔

اسلام اپنی انسانی تعلیمات کے اعتبار سے گویا ایک قسم کا صدقہ کلچر ہے۔ اسلام آدمی کے اندر دوسروں کے لئے دینے کا جذبہ (spirit of giving) پیدا کرتا ہے۔ اسی جذبہ کی ایک بڑھی ہوئی صورت وہ ہے جس کی مثال مذکورہ حدیث میں نظر آتی ہے۔ ایمان آدمی کو دینے والا انسان بناتا ہے۔ دوسرے لوگ اگر خود سے نہ مانگیں تب بھی وہ ہر وقت دوسروں کو دینے کے لئے تیار رہتا ہے، خواہ اس کو ایسا کرنے کے لئے دوسرے کا مقتدی بننا پڑے۔

آفاقی آواز

آپ کی میز پر ریڈیو سیٹ رکھا ہوا ہے۔ بظاہر وہ خاموش ہے۔ اس میں کوئی آواز نہیں۔ لیکن جب آپ نے اس کو کھولا تو اچانک اس میں سے آوازیں آنے لگیں۔ بامعنیٰ آوازیں، جس کا ایک ایک لفظ آپ سمجھ رہے تھے۔ جس کی ایک ایک بات آپ کے ذہن میں اترتی چلی جارہی تھی۔ اس کے بعد جب آپ نے اس کا سوئچ دبا کر اس کو بند کیا تو دوبارہ اچانک تمام آوازیں بند ہوگئیں۔ اب بولتا ہوا ریڈیو خاموش ہوگیا۔ اب بھی وہی مشین آپ کی میز پر رکھی ہوئی ہے۔ مگر اس سے کوئی آواز نہیں آرہی ہے جس کو آپ سن سکیں۔

کائنات بھی اسی قسم کا ایک بہت بڑا خدا کا ریڈیو سیٹ ہے۔ وہ ہر آن پیغامات نشر کررہا ہے۔ کسی وقفہ کے بغیر ہر لمحہ اس سے آوازیں نکل رہی ہیں۔ وہ ہر صبح و شام یہ اعلان کررہا ہے کہ یہ دنیا کیا ہے۔ انسان کو یہاں کیوں پیدا کیا گیا ہے۔ انسان کی کامیابی کیا ہے اور ناکامی کیا۔ انسان کہاں سے آیا ہے اور کہاں وہ دوبارہ لوٹ کر جائے گا۔ حق و باطل کا وہ کون سا خدائی معیار ہے جس پر موت کے بعد انسان کو جانچا جائے گا اور جس کے مطابق اس کے ابدی انجام کا فیصلہ ہوگا۔

جس طرح انسانی ریڈیو کی آوازیں ہم صرف اس وقت سنتے ہیں جب کہ ہم اس کو آن کریں اور اسی کے ساتھ ہم اپنے کان کھلے رکھیں۔ اسی طرح کائنات کے عظیم تر ریڈیو سے نکلنے والی آوازیں بھی وہی لوگ سنتے ہیں جو اس کی طرف دھیان لگائیں اور اپنے دماغ کی کھڑکیاں اس کو سننے کے لئے کھلی رکھیں۔ کائناتی ریڈیو بظاہر اپنا پیغام خاموش انداز میں نشر کررہا ہے مگر سننے والوں کے لئے وہ ہر دوسری آواز سے زیادہ قابل سماعت ہے۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں پھیلا ہوا ہے، وہ سورج کی روشنی میں نمایاں ہے، وہ پانی کی لہروں میں موجزن ہے، وہ ہوا کی صورت میں ہمارے چاروں طرف داخل ہورہا ہے۔ غرض زمین کے پودوں سے لے کر آسمان کے ستاروں تک کوئی چیز ایسی نہیں جو اس آفاقی پیغام رسانی میں مصروف نہ ہو ـــــ سننے والا صرف وہ ہے جو اس کائناتی آواز کو سنے اور اس کو اپنی زندگی کے لئے نشان راہ بنالے۔

شکر یا سرکشی

ایک اچھی چیز آپ کو ملتی ہے۔اس کو اگر آپ اپنی محنت اور قابلیت کا نتیجہ سمجھیں تو آپ کے اندر سرکشی کا جذبہ پیدا ہوگا۔اور اگر آپ اس کو خدا کی طرف سے ملی ہوئی چیز سمجھیں تو آپ کے اندر شکر کا جذبہ جاگ اٹھے گا۔پہلی کیفیت کا نام گمراہی ہے اور دوسری کیفیت کا نام ہدایت یابی۔

موجودہ دنیا کو امتحان کی مصلحت کے تحت بنایا گیا ہے۔تمام واقعات بلاشبہہ اللہ کی مرضی سے اور اس کے اذن سے ہو رہے ہیں۔مگر تمام واقعات پر اسباب کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ اسباب کے ظاہری پردہ کو ہٹا کر اصل واقعہ کو دیکھے اور اس پر ایمان لائے۔

آپ کے اندر ایک چیز کی طلب پیدا ہوتی ہے۔آپ اس کے لئے کوشش شروع کرتے ہیں۔آپ کی کوشش مختلف مراحل سے گزرتی ہے۔کہیں آپ اپنا ذہن استعمال کرتے ہیں، کہیں اپنی عملی طاقت لگاتے ہیں اور کہیں اپنا اثاثہ خرچ کرتے ہیں۔اس طرح بظاہر اسباب وعلل کے راستہ سے گزرتی ہوئی آپ کی کوشش اپنے انجام تک پہنچتی ہے۔آپ اپنے مقصود کو پا لیتے ہیں۔

اب اگر آپ کو صرف ظاہر بیں نگاہ حاصل ہے تو آپ اپنی کامیابی کو اپنی کوشش کا نتیجہ سمجھیں گے۔لیکن اگر آپ کو وہ نگاہ حاصل ہو جو باتوں کو اس کی گہرائی کے ساتھ دیکھ سکے تو آپ جان لیں گے کہ جو ہوا وہ خدا کے کئے سے ہوا، یہ میرا کوئی ذاتی کارنامہ نہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا امتحان ہو رہا ہے۔آدمی پر لازم ہے کہ وہ ظاہری پردہ کو پھاڑ کر اندرونی حقیقت کو دیکھے۔بظاہر اپنے ہاتھ سے ہونے والے کام کے بارہ میں یہ دریافت کرے کہ وہ حقیقۃً خدا کے ہاتھ سے انجام پا رہا ہے۔

جو لوگ اس بصیرت کا ثبوت دے سکیں وہی معرفت والے لوگ ہیں اور جو لوگ اس بصیرت کا ثبوت نہ دیں وہی وہ لوگ ہیں جو معرفت سے محروم رہے۔

نماز کی پہچان

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: **واقم الصلوۃ إن الصلوۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر** (العنکبوت ۴۵) یعنی تم نماز قائم کرو، بے شک نماز بے حیائی سے اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی نماز کی پہچان کیا ہے۔ حقیقی نماز کی پہچان یہ ہے کہ وہ نمازی کے لئے ناھئی منکرات بن جائے، وہ نمازی کو ناپسندیدہ باتوں اور برے کاموں سے روکنے لگے۔ جس نماز میں یہ صفت پائی جائے وہی اللہ کی مطلوب نماز ہے اور جو نماز اس صفت سے خالی ہو وہ بلاشبہہ اللہ کی مطلوب نماز نہیں۔

نماز ناھئی منکرات کیسے بنتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ آدمی جب نماز کو اس کی ظاہری صورت اور داخلی اسپرٹ کے ساتھ ادا کرے تو اس سے آدمی کے اندر وہ حساسیت بیدار ہوتی ہے جس کو قرآن میں خشوع کہا گیا ہے۔ یہی حساسیت وہ چیز ہے جو آدمی کے لئے ناھئی منکرات بن جاتی ہے۔

اس معاملہ کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر ایک شخص کے اندر صفائی کا گہرا احساس پیدا ہو جائے تو وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا کہ پھل کھانے کے بعد اس کا چھلکا راستہ میں ڈال دے یا دیا سلائی اور سگریٹ کے خالی ڈبے استعمال کے بعد سڑک پر پھینک دے۔ ایسے آدمی کے لئے اس کا صفائی کا مزاج اس قسم کے کسی فعل کے لئے ایک مستقل داخلی رکاوٹ بن جائے گا۔ اسی طرح جو آدمی نماز کو اس کی حقیقی صورت میں ادا کرے تو اس کے اندر لازمی طور پر خشوع اور تقویٰ کا مزاج پرورش پاتا ہے۔ یہی مزاج اس کے لئے اس میں رکاوٹ بن جاتا ہے کہ وہ منکرات اور فواحش میں ملوث ہو۔ اپنے اس عبادتی مزاج کی بنا پر اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ وہ منکرات وفواحش سے اسی طرح بچنے لگتا ہے جس طرح صفائی کا مزاج رکھنے والا اپنے آپ کو گندی چیزوں سے بچاتا ہے۔ جو نماز آدمی کے اندر اس قسم کا مزاج پیدا کرے وہی اللہ کی مطلوب نماز ہے۔ اور جس نماز سے آدمی کے اندر یہ مزاج پیدا نہ ہو وہ اللہ کی مطلوب نماز نہیں، اگرچہ وہ بظاہر نماز دکھائی دیتی ہو۔

جاننے کی بات

ایک انگریز نے ایک مرتبہ مجھ سے اپنا ایک واقعہ بتایا۔ یہ واقعہ دسمبر ۱۹۷۳ کا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے انگلینڈ سے سوئزرلینڈ جانا تھا۔ وہاں زیورک میں میری بہن رہتی تھی، اس سے مجھے ملنا تھا۔ یہ سفر میں نے کار کے ذریعہ کیا۔ میں لندن سے روانہ ہوا اور اپنی گاڑی چلاتا ہوا سوئزرلینڈ میں داخل ہوگیا۔ انگلینڈ میں بائیں چلو (keep left) کا اصول ہے، اور سوئزرلینڈ میں دائیں چلو (keep right) کا اصول۔ میں زیورک (سوئیزرلینڈ) میں داخل ہوا تو مجھے یاد نہ رہا کہ اب میں نئے ملک میں ہوں، اور اس ملک کے اصول کے مطابق یہاں مجھے اپنی گاڑی سڑک کے دائیں طرف چلانا چاہئے۔ اپنی پچھلی عادت کے زیر اثر میں سڑک کے بائیں طرف اپنی گاڑی دوڑانے لگا۔

ابھی کسی حادثہ کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ٹریفک کانسٹبل نے مجھے دیکھ لیا۔ اس نے ویسل دے کر مجھے روکا۔ میرے قریب آکر اس نے میری گاڑی کی پلیٹ دیکھی، میرا حلیہ دیکھا۔ اپنے تجربہ کی بنا پر وہ سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے جان لیا کہ یہ ایک انگلش آدمی ہے اور انگلش ہونے کی بنا پر سڑک کے بائیں طرف اپنی گاڑی دوڑا رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے معنیٰ خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا کہ تم کو جاننا چاہئے کہ اس وقت تم انگلینڈ میں نہیں ہو۔ اس وقت تم سوئیزرلینڈ میں ہو: You are not (in England now.)

انسانی انتظام کے اعتبار سے انگلینڈ اور سوئیزرلینڈ میں فرق ہے۔ مگر ایک اور پہلو سے ساری دنیا کا معاملہ ایک ہے۔ وہ یہ کہ یہ دنیا خدا کی دنیا ہے۔ یہاں خدا کا قانون ہی واحد قانون ہے جو کسی آدمی کے لئے نجات اور کامیابی کا ضامن ہے۔

مگر ہر آدمی اس حقیقت سے بے خبر ہو کر اپنی زندگی کی گاڑی اپنی پسند کے رخ پر دوڑا رہا ہے۔ دنیا میں ہر قدم پر خدا کے فرشتے کھڑے ہوئے ہیں جو خاموش زبان میں کہہ رہے ہیں کہ اے انسان، تو اپنی دنیا میں نہیں ہے، تو خدا کی دنیا میں ہے۔ جو شخص اس آواز کو سن کر اپنا رخ درست کرلے وہ کامیاب ہے، اور جو شخص اس آواز کو نہ سنے، اس کے لئے بربادی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

تجزیاتی اسلوب، شاعرانہ اسلوب

تجزیاتی اسلوب کیا ہے اور تخیلاتی اسلوب کیا ہے، اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شاعر گلاب کے درخت کو دیکھتا ہے۔ اس کی شاخ میں لطیف پھول کے ساتھ کانٹے بھی لگے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر شاعر کے ذہن میں ایک خیالی مضمون آتا ہے۔ وہ اس مضمون کو ایک شعر کے روپ میں اس طرح ڈھال دیتا ہے:

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے اگر کانٹوں میں ہو خوئے حریری

اس شعر میں جو بات کہی گئی ہے وہ محض خیال آرائی ہے۔ اس لئے کہ گلاب کے کانٹوں نے کبھی بھی ایسا نہیں کیا کہ وہ دفاعی فوج بن کر پھول کی حفاظت کریں۔ جب بھی کوئی شخص پھول توڑنا چاہتا ہے تو وہ نہایت آسانی سے پھول کو توڑ لیتا ہے اور شاخ میں لگے ہوئے کانٹے بدستور غیر متحرک حالت میں پڑے رہتے ہیں۔

البتہ پھول کا حسن خود اپنی ذات میں پھول کی حفاظت ہے۔ جب بھی کوئی شریر بچہ یا کوئی بے حس آدمی پھول کو توڑنا چاہتا ہے تو تمام باذوق افراد پھول کی حمایت میں بولنے لگتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پھول کو توڑ کر اس کو برباد نہ کرو بلکہ اس کے حسن سے تم خود بھی محظوظ ہو اور دوسروں کو بھی اس سے محظوظ ہونے کا موقع دو۔ ہر پھول جو اپنی شاخ میں کھل کر اپنی بہار دکھاتا ہے وہ خود اپنے حسن کی بدولت زمین کی زینت بنتا ہے نہ کہ کانٹوں کی حفاظت کی بدولت۔

گلاب کے پھول کے واقعہ کو اگر آپ تجزیاتی نظر سے دیکھیں تو آپ کو اس میں یہ سبق ملے گا کہ اس دنیا میں کوئی آدمی اگر اپنے اندر کوئی خوبی یا نفع بخشی پیدا کرلے تو اس کی یہ صفت اپنے آپ اس کی حفاظت کی ضمانت بن جائے گی۔ لیکن اسی واقعہ کو اگر تخیلاتی نظر سے دیکھا جائے تو دیکھنے والا نہ اس کی اصل حقیقت کو سمجھے گا اور نہ وہ اس سے کوئی نصیحت لینے میں کامیاب ہو سکے گا۔ تجزیاتی طریقہ آدمی کے شعور کو جگاتا ہے اور تخیلاتی طریقہ آدمی کو بے شعوری کے اندھیرے میں گم ہونے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

دشمن اور مُقاتِل کا فرق

قرآن میں ایک طرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ ایک شخص اگر بظاہر تمہارا دشمن ہو تب بھی تم اس کے ساتھ احسن طریق پر معاملہ کرو، عین ممکن ہے کہ وہ کسی دن تمہارا دوست بن جائے (حٰم السجدۃ ۳۴) دوسری طرف قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جن لوگوں نے تم سے قتال نہیں کیا ان سے تم کو بھلائی کا معاملہ کرنا چاہئے۔ مگر اللہ اس سے روکتا ہے کہ تم ان لوگوں سے بھلائی کے ساتھ معاملہ کرو جو تمہارے ساتھ قتال کر رہے ہیں (الممتحنۃ ۸)

ان دونوں آیتوں کا تقابلی مطالعہ بتاتا ہے کہ قرآن عدو (enemy) اور مُقاتل (combatant) کے درمیان فرق کرتا ہے۔ قرآن کا حکم یہ ہے کہ بظاہر اگر کوئی شخص یا گروہ تمہارا دشمن ہو تب بھی تم کو اس کے ساتھ اچھا تعلق قائم رکھنا چاہئے تاکہ دعوت کا عمل معتدل انداز میں جاری رہے۔ ظاہری دشمنی کو اختلاط (interaction) میں رکاوٹ نہیں بننا چاہئے کیوں کہ اختلاط سے دعوت کا عمل جاری رہتا ہے اور دعوت کا عمل دشمن کو بھی دوست بنانے کی طاقت رکھتا ہے۔ البتہ مُحارب یا مُقاتل (combatant) کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عملاً اور یکطرفہ طور پر اہل ایمان کے خلاف جنگ چھیڑ دیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ ہنگامی اصول یا جنگی اخلاقیات کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔ حتی کہ ان کے ساتھ اس وقت تک قطع تعلق بھی کیا جاسکتا ہے جب تک وہ جنگ سے باز نہ آئیں۔

یہ ایک بے حد اہم فرق ہے جس کو عملی زندگی میں اختیار کرنا ضروری ہے۔ اہل ایمان اگر اس فرق کو نہ سمجھیں تو وہ دشمن سے بھی مقاتل جیسا معاملہ کرنے لگیں گے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام کے دعوتی مصالح مجروح ہوں گے اور دعوت وتبلیغ کا مطلوب عمل رک جائے گا۔ صحیح یہ ہے کہ جو شخص یا گروہ بالفعل مسلح جنگ چھیڑ دے اس کے مقابلہ میں تو سخت احتیاط کا برتاؤ کیا جائے گا۔ حتی کہ معتدل تعلق سے بھی پرہیز کیا جائے گا۔ کیوں کہ یہ اندیشہ ہے کہ اس کے ذریعہ مُقاتل فریق اہل ایمان کے جنگی راز معلوم کرلے۔ مگر جہاں تک عام انسان کا تعلق ہے تو ظاہری دوستی یا ظاہری دشمنی کا لحاظ کئے بغیر ہر ایک سے یکساں انسانی تعلق قائم رکھا جائے گا۔ تاکہ اسلام کا دعوتی عمل غیر منقطع طور پر جاری رہے، وہ کسی حال میں رکنے نہ پائے۔

با مقصد زندگی نہ کہ پر راحت زندگی

۲۰۰ صفحات پر مشتمل ایک انگریزی کتاب نظر سے گزری۔ یہ کتاب پہلی بار ٹورانٹو سے ۱۹۹۶ میں چھپی۔ میرے سامنے اس کا پیپر بیک ایڈیشن ہے جو سان فرانسسکو سے ۱۹۹۹ میں چھپا۔ اس کا نام یہ ہے:

The Monk Who Sold his Ferrari, A Fable about Fulfilling your Dreams and Reaching your Destiny— by Robin S. Sharma

اس کتاب میں پر مسرت زندگی کا راز بتایا گیا ہے۔ اس کتاب کے چھپنے کے بعد اس پر غیر معمولی تبصرے کئے گئے۔ ایک مشہور مغربی مصنف جوٹائی (Joe Tye) نے اس کتاب پر اظہار رائے کرتے ہوئے اس کے بارہ میں کہا کہ ــــــــ سچی کامیابی اور خوشی کا ایک طاقتور اور شاندار فارمولا:

An elegant and powerful formula for true success and happiness.

یہ کتاب کہانی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس فرضی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ امریکہ کا ایک کامیاب وکیل کافی پیسہ کمالیتا ہے۔ مگر اس کے بعد وہ ذہنی تناؤ (mental tension) کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو ہارٹ اٹیک ہو جاتا ہے۔ آخر کار وہ تنگ آ کر سکون کی تلاش میں اپنی بیش قیمت گاڑی (Ferrari) کو بیچ کر ہمالیہ پہاڑ پر چلا جاتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک مفروضہ یوگی رمن سے ہوتی ہے۔ یوگی رمن اس کو اپنے خیالی جھونپڑے (hut) میں لے جاتا ہے جو پھولوں سے ڈھکا ہوا ہے۔

یوگی رمن امریکی وکیل کو بتاتا ہے کہ پر مسرت زندگی حاصل کرنے کی تدبیر کیا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ پر مسرت زندگی کا سرچشمہ خود تمہارے اپنے اندر ہے۔ اپنے اندر چھپی ہوئی توانائی کو باہر لاؤ اور تم صحت منداور پر مسرت زندگی حاصل کرلوگے۔ اس کے بعد یوگی رمن امریکی وکیل کو اس مقصد کے لئے کچھ خاص ٹکنیک بتاتا ہے۔ اس ٹکنیک کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً گلاب کا پھول سامنے رکھ کر اپنی نگاہ اس پر جمانا۔ تنہائی میں بیٹھ کر زور زور سے ہنسنا، مختلف قسم کے منتر کا جاپ کرنا۔ مثلاً دن میں ۳۰ بار زور

زور سے یہ الفاظ کہنا: میں اس سے زیادہ ہوں جتنا میں دکھائی دیتا ہوں، دنیا کی تمام طاقت میرے اندر موجود ہے، میں منظّم ہوں اور توانائی سے بھرا ہوا ہوں:

I am more than I appear to be. All the world's strength and power rest inside me. I am disciplined and energized.

یوگی رمن نے امریکی وکیل کو بتایا کہ اس قسم کی مختلف ذہنی اور نفسیاتی ورزشوں کے ذریعہ تم اپنے آپ کو اس حد تک تیار (conditioned) کر سکتے ہو کہ تم سلف ماسٹری (self mastery) کے درجے تک پہنچ جاؤ اور پھر تم وہ سب کچھ حاصل کر لو گے جو تم چاہتے ہو۔ صحت، جوانی، مسرت، کامیابی اور لمبی زندگی۔

تبصرہ

اس کتاب پر میں نے گہرائی کے ساتھ غور کیا مگر وہ مجھے ایک پر لطف کہانی کے سوا کچھ اور نظر نہ آئی۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ پچھلے ۵ ہزار سال سے بے شمار دانا لوگ (sages) روحانی ترقی کے اس فارمولا پر عمل کرتے رہے ہیں اور آج بھی وہ عمل کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں پہلا سوال یہ ہے کہ مصنف کو اپنی بات پیش کرنے کے لئے کوئی حقیقی کردار کیوں نہ ملا۔ کیا وجہ ہے کہ انہوں نے یوگی رمن کے نام سے ایک فرضی کردار تخلیق کیا اور اس کے حوالہ سے اپنا خیالی نظریہ مرتب کر ڈالا۔

دوسری بات یہ کہ مفروضہ یوگی رمن نے جو ٹکنیک امریکی وکیل کو بتائی وہ سب جسمانی نوعیت کی تھی اور جسمانی ورزش (physical exercise) سے روحانی نتیجہ (spiritual result) کبھی ممکن نہیں۔

تیسری بات یہ کہ مسرت (happiness) بذات خود کوئی منزل نہیں۔ یہ ایک حیوانی منزل ہو سکتی ہے مگر وہ کوئی انسانی منزل نہیں۔ اس لئے کہ پر مسرت زندگی بالفرض حاصل ہو سکے تب بھی وہ اس قیمت پر ہوگی کہ انسان کی بہت سی اعلیٰ صلاحیتیں غیر استعمال شدہ رہ جائیں گی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص مقوی غذائیں کھا کر اپنے جسم کو فربہ بنالے مگر وہ دماغی بڑھوتری سے محروم ہو گیا ہو۔ انسان کی منزل با مقصد زندگی ہے نہ کہ صرف پر مسرت یا پر راحت زندگی۔

چوتھی بات یہ کہ ذہنی تناؤ کوئی برائی (evil) نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ذہنی تناؤ انسانی ترقی کے لئے ایک مہمیز کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیچر نے انسان کی ترقی کے لئے شاک ٹریٹمنٹ کا طریقہ مقرر کیا ہے۔ ساری تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ تمام بڑے انسان ہمیشہ ناموافق حالات میں بنے ہیں نہ کہ موافق حالات میں۔ موافق حالات یا پرسکون حالات احمقوں کی جنت (fool's paradise) تو وجود میں لا سکتے ہیں مگر وہ دانشمندوں کی دنیا کی تخلیق نہیں کر سکتے۔

تخلیق کے اعتبار سے دیکھا جائے تو انسانی وجود کے دو حصے ہیں ـــــ جسم اور دماغ۔ دونوں کے تقاضے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ انسان کا جسم مادی غذا پر زندہ رہتا ہے۔ اچھی غذائیں اور صحت بخش ماحول اگر اسے حاصل ہو جائے تو جسم فربہ اور تندرست ہو جائے گا۔

لیکن جسم کی فربہی یا تندرستی کا کچھ بھی تعلق دماغ کے ارتقاء سے نہیں ہے۔ نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ دماغ (brain) بے شمار چھوٹے چھوٹے اجزاء (cells) کا مجموعہ ہے۔ یہ اجزاء پیدائشی طور پر خوابیدہ حالت میں ہوتے ہیں۔ ان کو متحرک کرنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ چیلنج ہے۔ زندگی سے مقابلہ کرتے ہوئے انسان کو مختلف قسم کے جو چیلنج پیش آتے ہیں وہی دماغی ذرّات کو متحرک کرتے ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مذکورہ کتاب نہ صرف ایک فرضی کہانی ہے بلکہ وہ سائنسی حقائق کے سراسر خلاف ہے۔ اس کتاب کی اسکیم اگر بالفرض وہ واقعہ بن سکے تو اس کے نتیجہ میں کچھ فربہ جسم تو ضرور دکھائی دیں گے لیکن ارتقاء یافتہ انسانی ذہن کا زمین سے خاتمہ ہو چکا ہوگا۔

تالیف قلب

قرآن کی سورہ نمبر ۹ میں بتایا گیا ہے کہ زکوٰۃ (صدقات) کے خرچ کی مدیں کیا کیا ہیں اور وہ کن لوگوں کو دی جائیں گی۔ ان مستحقین میں سے ایک قسم وہ ہے جن کو قرآن میں مؤلفۃ القلوب کہا گیا ہے (التوبۃ ۶۰)۔ یعنی وہ لوگ جن کی دلجوئی کرنا مقصود ہو۔ اس سے مراد وہ افراد ہیں جن کو اسلام کی طرف راغب کرنا ہو یا وہ اسلام قبول کرنے کے باوجود کمزور ہوں اور انہیں ایمان پر مستحکم کرنے کے لئے مالی دلجوئی کی ضرورت ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں دونوں قسم کے لوگوں کو اس مقصد کے لیے یہ عطیات دئے۔ مثلاً نومسلموں میں اقرع بن حابس کو، اور غیر مسلموں میں صفوان بن امیہ کو، وغیرہ۔

بعد کو عباسی خلافت کے زمانہ میں جب اسلامی فقہ کی تدوین ہوئی تو بیشتر علماء اس کے قائل ہو گئے کہ اسلام کے عزت اور غلبہ کے بعد اب مؤلفۃ القلوب کی مد ساقط اور منقطع ہو چکی ہے۔ مفسر القرطبی نے لکھا ہے کہ: **انقطع هذا الصنف بعز الإسلام و ظهوره (الجامع لأحكام القرآن، ۱۸۱/۸)**۔

تالیفِ قلب کا یہ مسئلہ کسی بھی کتاب کے متعلق ابواب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً قاضی محمد ثناء اللہ العثمانی نے یہ بتاتے ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں مؤلفۃ القلوب کو ترغیب کے لیے خمس یا زکوۃ میں سے عطیات دئے، لکھتے ہیں: **وأما اليوم فقد أعز الله تعالىٰ الإسلام و له الحمدوأغناه عن أن يتألف عليه رجال فلا يعطى مشرك تالفا بحال و قد قال بهذا كثير من أهل العلم أن المؤلفة منقطعة و سهمهم ساقط (التفسير المظهرى، ۲۳۴/۴)** یعنی جہاں تک آج کا تعلق ہے، تو اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت و طاقت دے دی ہے اور اسلام کو اس سے مستغنی کر دیا ہے کہ کسی کی تالیف قلب کی جائے۔ پس کسی بھی مشرک کو کسی بھی حال میں تالیف قلب کے لئے کچھ نہیں دیا جائے گا۔ اور اکثر اہل علم کا یہی قول ہے کہ مؤلفۃ القلوب کی مد منقطع ہے اور ان کا حصہ ساقط ہو چکا ہے۔ (نیز ملاحظہ ہو، فتح القدیر للشوکانی ۳۷۴/۲)

بعد کے زمانہ کے اکثر علماء کا مسلک یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تالیف قلب کی یہ مد باقی نہ رہی۔ گویا کہ اب مالِ زکوۃ کی صرف سات مدیں ہیں نہ کہ قرآن کے بیان کے مطابق، آٹھ مدیں۔ ان لوگوں کے نزدیک تالیفِ قلب کی حکمت ضعف ہے۔ یعنی اسلام جب ضعیف تھا تو اپنے

ضعف کی مالی تلافی کے لیے زکوۃ میں یہ مد مقرر کی گئی۔ مگر اسلام جب طاقتور ہو گیا تو اس قسم کی مالی دلجوئی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس بنا پر بعد کو یہ مد ساقط یا موقوف ہو گئی۔ فقہاء میں امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا یہ مسلک کلیتًا ہے اور دوسرے علماء کا کسی قدر گنجائش کے ساتھ۔ مثلاً یہ کہ اب نو مسلم کو دیا جا سکتا ہے مگر کسی غیر مسلم کو نہیں دیا جائے گا۔ ان کے نزدیک نو مسلم لوگ فقراء مسلمین کے حکم میں داخل ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تالیف قلب کا حکم نہ تو ساقط ہوا ہے اور نہ یہ حکم ضعفِ اسلام کی بنا پر تھا۔ یہ حکم مصلحتِ دعوت کی بنا پر ہے نہ کہ ضعف اسلام کی بنا پر۔

اسلامی دعوت میں اصل انحصار دلیل پر ہوتا ہے۔ داعی کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ دلیل کی قوت سے مدعو کو مطمئن کرے اور اُس کے اندر ذہنی تبدیلی لائے۔ مگر اس دعوتی عمل میں کچھ چیزوں کی ضرورت بطور معاون ہوتی ہے۔ مثلاً نرم گفتاری، اعلیٰ اخلاق، مدعو کے ساتھ تقریب کا معاملہ کرنا۔ چنانچہ تقریب دعوت کی اسی مصلحت کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد تقریباً سولہ ماہ تک یہود کے قبلہ کو اپنا قبلہ بنائے رکھا۔ (تفسیر القرطبی، ۲/۱۵۰)

تالیفِ قلب کی انہی صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ مال یا تحفہ کے ذریعہ ان کی دلجوئی کی جائے۔ اس مقصد کے لئے دوسرے اموال کے علاوہ زکوۃ کی رقم بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔ مال زکوۃ کے خرچ کی یہ مد ابدی ہے، وہ اس وقت تک باقی رہے گی جب تک دعوت کا عمل لوگوں کے درمیان جاری ہو، خواہ مسلمان، سیاسی اعتبار سے، طاقت کی حالت میں ہوں یا ضعف کی حالت میں۔

تالیفِ قلب (دلجوئی) کا تعلق صرف زکوۃ کے مال سے نہیں ہے۔ اس کو زکوۃ کی ۸ مدوں میں سے ایک مد قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ مدعو گروہ کی آخری حد تک رعایت کرو۔ حتی کہ ان کی دلجوئی کے لئے اگر زکوۃ کے اموال سے دینا ہو تو اُس میں سے بھی انہیں دو۔

تالیفِ قلب آدابِ دعوت کا ایک عام اصول ہے۔ اس کا تعلق ہر اس پہلو سے ہے جو مدعو کے دل میں اسلام کے لئے نرم گوشہ (soft corner) پیدا کرنے والا ہو۔ قرآن وسنت میں اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ مثلاً حضرت موسیٰ کا فرعون سے نرم زبان میں کلام کرنا (طٰہٰ ۴۴)، پیغمبروں کا اپنی مخاطب قوم سے یہ کہنا کہ ہم تو تمہاری ایذاؤں پر صبر ہی کریں گے (ابراہیم ۱۲) مخالف لوگوں سے موعظت حسنۃ (النحل ۱۲۵)، وغیرہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملی تو آپ نے بنو ہاشم کے لوگوں کو اپنے گھر پر بلایا تا کہ انہیں توحید

کا پیغام دیں۔ اس موقع پر آپ نے پہلے ان کی تواضع کی اور انہیں دودھ پلایا۔ جب وہ اس سے فارغ ہو گئے تو اس کے بعد آپ نے انہیں نبوت کا پیغام دیا۔ یہ بھی مدعو کے حق میں تالیفِ قلب کی ایک صورت تھی۔ (مسند احمد، الجزء الاول، صفحہ ۱۵۹)

تالیف قلب دراصل ایک جامع حکم ہے جس کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً ایک بدو مدینہ کی مسجد نبوی میں آیا۔ اُس نے مسجد کے اندر پیشاب کر دیا۔ لوگ اس کو مارنے کے لیے دوڑے تو آپ نے لوگوں کو منع کر دیا اور بدو کو زجر و توبیخ کے بغیر واپس کر دیا۔ یہ بھی تالیفِ قلب کی ایک صورت تھی۔

اسی طرح قبیلۂ دُوس کے طفیل بن عمرو الدوسی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد وہ اپنی قوم کی طرف واپس گئے اور اس کو اسلام کی دعوت دی۔ مگر قوم نے اسلام قبول نہیں کیا بلکہ ان کو ستایا اور سرکشی کا معاملہ کیا۔ وہ دوبارہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور قبیلہ کی شکایت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ دُوس کے حق میں دعا کی اور طفیل بن عمرو الدوسی سے کہا کہ تم اپنی قوم کی طرف واپس جاؤ، اس کو اسلام کی طرف دعوت دو اور اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرو (**ارجع الی قومک فادعهم وارفق بهم**)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت بھی مدعو کے حق میں تالیفِ قلب کی ایک مثال ہے۔ (سیرت ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۴۰۹)

جو لوگ مؤلفۃ القلوب کے حصہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منقطع یا منسوخ مانتے ہیں ان کی اس رائے کی ایک خاص بنیاد حضرت عمر فاروق کا ایک واقعہ ہے۔ ابن ہمام کی روایت ہے کہ عیینہ اور اقرع خلیفہ ابوبکر صدیق کے پاس آئے اور ایک زمین کی مانگ کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے پہلے تالیف قلب کے طور پر کچھ مال دیا تھا۔ ان کی مانگ پر ان کے لیے حضرت ابوبکر نے ایک تحریر لکھ کر دی۔ حالانکہ یہ دونوں مدینہ کے صاحب ثروت افراد تھے۔

یہ دونوں جب باہر آئے تو ان کی ملاقات حضرت عمر فاروق سے ہوئی۔ حضرت عمر نے تحریر کو لے کر پھاڑ دیا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ اس کے بعد یہ معاملہ خلیفہ ابوبکر صدیقؓ کے سامنے آیا۔ حضرت عمر نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چیز تم کو تالیف قلب کے لیے دی تھی۔ اب اللہ نے اسلام کو طاقتور بنا دیا ہے اور اس کو تم سے بے نیاز کر دیا ہے۔ حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کی اس رائے سے اتفاق کیا۔ (التفسیر المظہری ۴/۲۳۶)۔

اس واقعہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تالیفِ قلب کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اصل یہ ہے کہ تالیفِ قلب

کے لیے جو مال دیا جاتا ہے وہ مؤلفۃ القلوب کے مطالبہ پر نہیں دیا جاتا بلکہ حاکم کی اپنی صوابدید پر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ دونوں اشخاص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی فیصلہ کے تحت کچھ مال دیا تھا نہ کہ ان کے مطالبہ کی بنیاد پر۔ اس کے بعد جب حضرت ابوبکر کی خلافت کا زمانہ آیا تو ان دونوں صاحبان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ کا غلط استعمال کرتے ہوئے خود اپنی طرف سے یہ مانگ کی کہ ہم کو فلاں زمین عطیہ میں دی جائے۔ یہ ایک قسم کا استحصال (exploitation) تھا۔ حضرت عمر فاروق نے معاملہ کی اس نوعیت کو سمجھا اور درمیان میں پڑ کر دونوں صاحبان کو اس سے روک دیا کہ وہ مسلمانوں کے اموال کو غلط طور پر حاصل کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ تالیف قلب اسلام کا ایک مستقل اصول ہے۔ وہ اپنی مختلف صورتوں میں ہر حال میں جاری رہتا ہے خواہ امن کے حالات ہوں یا جنگ کے حالات، اور خواہ اہل اسلام بے اقتدار ہوں یا اقتدار کی حالت میں ہوں، کسی بھی حال میں تالیفِ قلب کا حکم ساقط یا موقوف نہیں ہوتا۔

دعوت الی اللہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، خیر خواہی کا ایک عمل ہے (الاعراف ۷۹)۔ یہ دراصل انسانیت کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ ہے جو ایک مومن کو مجبور کرتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو اللہ کی رحمت کے سایے میں لانے کی کوشش کرے۔ اسی خیر خواہی کی بنا پر مومن یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی بات اس طرح مؤثر انداز میں کہے کہ وہ سننے والے کے دل میں اُتر جائے (النساء ۶۳)۔ یہی جذبہ داعی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے مخاطب کی زیادتیوں پر یک طرفہ صبر کرے تاکہ پیغام رسانی کا ماحول بگڑنے نہ پائے (ابراہیم ۱۲)، وغیرہ۔

اس قسم کی مختلف چیزیں گویا آداب دعوت سے تعلق رکھتی ہیں۔ دعوت کے انہی آداب میں سے ایک متعین چیز وہ ہے جس کو تالیفِ قلب کہا جاتا ہے، یعنی مدعو کی دل جوئی اور اس کی رعایت۔ جس طرح ایک سچا تاجر اپنے گاہک کی آخری حد تک رعایت کرتا ہے تاکہ اس کے ساتھ مستحکم تجارتی تعلقات قائم ہوں۔ اسی طرح داعی ہر ممکن طریقہ سے اپنے مدعو کی دل جوئی کرتا ہے تاکہ وہ اس کے دعوتی پیغام کی طرف پوری طرح راغب ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تالیفِ قلب دعوت وتبلیغ کا مستقل اصول ہے، کسی بھی حال میں اور کسی بھی صورت میں اس کو ساقط نہیں کیا جا سکتا۔

جہاد کا تصور اسلام میں

جہاد کا مادہ جہد ہے۔ جہد کے معنی ہیں کوشش کرنا (to strive, to struggle)۔ اس لفظ میں مبالغہ کا مفہوم ہے یعنی کسی کام میں اپنی ساری کوشش صرف کر دینا۔ عربی میں کہا جاتا ہے کہ 'بذل جهده' یا 'بذل مجهوده' یعنی اس نے اپنی پوری طاقت صرف کر دی۔ لسان العرب میں ہے کہ: جهد الرجل فی كذا أی جد فيه و بالغ (۳/ ۱۳۳) آدمی نے فلاں معاملہ میں جدوجہد کی، یعنی اس میں مبالغہ کی حد تک کوشش کر ڈالی۔

جہاد مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یعنی کسی کام میں اپنی ساری ممکن کوشش صرف کرنا۔ لسان العرب میں ہے: الجهاد: المبالغة و استفراغ الوسع فی الحرب أو اللسان أو ما أطاق من شئ (۳/ ۱۳۵)۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وجاهدوا فی الله حق جهاده (الحج ۷۸) یعنی اللہ کی راہ میں خوب کوشش کرو جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے۔

عربی زبان میں جہاد اصلاً صرف کوشش یا بھرپور کوشش کے معنیٰ میں ہے۔ دشمن سے جنگ بھی چوں کہ کوشش کی ایک صورت ہے اس لیے توسیعی مفہوم کے اعتبار سے دشمن کے ساتھ جنگ کو بھی جہاد کہہ دیا جاتا ہے۔ تاہم اس دوسرے مفہوم کے لیے عربی میں اصل لفظ قتال ہے نہ کہ جہاد۔

دشمن سے جنگ ایک اتفاقی واقعہ ہے جو کبھی پیش آتا ہے اور کبھی پیش نہیں آتا۔ لیکن جہاد ایک مسلسل عمل ہے جو مومن کی زندگی میں ہر دن اور ہر رات جاری رہتا ہے، وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ مستقل جہاد یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں اللہ کی مرضی پر قائم رہے۔ اس قیام میں جو چیز بھی رکاوٹ ہو اس کو اپنی زندگی پر اثر انداز نہ ہونے دے۔ مثلاً نفس کی خواہش، مفاد کی طلب، رسم و رواج کا زور، مصلحتوں کے تقاضے، ذاتی اَنا کا مسئلہ، مال کی حرص، وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں عمل صالح کے لیے رکاوٹ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس قسم کی تمام رکاوٹوں کو زیر کرتے ہوئے اللہ کے حکم پر قائم رہنا، یہی اصل جہاد ہے، اور یہی جہاد کا ابتدائی مفہوم ہے۔ اس جہاد کے بارہ میں حدیث میں بہت سی روایتیں

آئی ہیں۔مثلاً مسند امام احمد کی چند روایتیں یہ ہیں:

المجاهد من جاهد نفسه للّٰه (۲۰/۶)

المجاهد من جاهد نفسه فی سبیل اللّٰه (۲۲/۶)

المجاهد من جاهد نفسه فی طاعة اللّٰه (۲۲/۶)

موجودہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے۔ یہاں کا پورا ماحول اس طرح بنایا گیا ہے کہ آدمی مسلسل طور پر آزمائش کے حالات سے گزرتا رہے۔ ان آزمائشی مواقع پر آدمی کو طرح طرح کی رکاوٹوں کا سامنا پیش آتا ہے۔ مثلاً ایک حق اس کے سامنے آئے مگر اس کا اعتراف کرنے میں اپنا درجہ نیچا ہوتا ہوا دکھائی دے، کسی کا مال آدمی کے قبضہ میں ہو اور اس کو حقدار کی طرف واپس کرنے میں اپنا نقصان نظر آتا ہو، تواضع کی مطلوب زندگی گذارنے میں اپنے نفس پر جبر کرنا پڑے، غصہ اور انتقام کے جذبات کو برداشت کرنا اپنی نفی کے ہم معنیٰ بن گیا ہو، انصاف کی بات بولنے میں یہ اندیشہ ہو کہ لوگوں کے درمیان مقبولیت ختم ہو جائے گی، خود غرضانہ کردار کے بجائے با اصول کردار اختیار کرنے میں سہولیات سے محرومی نظر آتی ہو، وغیرہ۔

اس طرح کے مختلف مواقع پر بار بار آدمی کو اپنی خواہش کو دبانا پڑتا ہے۔ اپنی نفسیات کی قربانی دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ حتی کہ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسے اپنی اُنا کو ذبح کرنا پڑے گا۔ اس طرح کے تمام مواقع پر ہر رکاوٹ کو عبور کرتے ہوئے اور ہر نقصان کو جھیلتے ہوئے حق پر قائم رہنا یہی اصلی اور ابتدائی جہاد ہے۔ جو لوگ اس جہاد پر قائم رہیں وہی آخرت میں جنت کے مستحق قرار دیے جائیں گے۔

جہاد اصلاً پُر امن جدو جہد کا عمل ہے۔ اسی پُر امن جدو جہد کی ایک صورت وہ ہے جس کو دعوت و تبلیغ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: **فلا تطع الکافرین و جاهد هم به جهاداً کبیرا** (الفرقان ۵۲) یعنی منکرین کی اطاعت نہ کرو اور ان کے ساتھ قرآن کے ذریعہ جہاد کبیر کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ باطل جو بات ان سے منوانا چاہتے ہیں اس کو ہرگز نہ مانو۔ بلکہ قرآن کی تعلیمات

کو لے کر ان کے خلاف دعوت وتبلیغ کا عمل کرو اور اس عمل میں اپنی آخری کوشش صرف کر دو۔ اس آیت میں جہاد سے مراد کوئی عسکری عمل نہیں ہے بلکہ اس سے مراد تمام تر فکری اور نظریاتی عمل ہے۔ اس عمل کو ایک لفظ میں ابطال باطل اور احقاق حق کہا جا سکتا ہے۔

جہاد بمعنیٰ قتال بھی اپنے ابتدائی مفہوم کے لحاظ سے پُر امن جدوجہد ہی کا دوسرا نام ہے۔ دشمن کی طرف سے اگر فوجی اور عسکری چیلنج دیا جائے تب بھی اولاً ساری کوشش اس بات کی کی جائے گی کہ اس کا جواب پُر امن طریقہ سے دیا جائے۔ پُر امن طریقہ کو صرف اُس وقت ترک کیا جائے گا جب کہ اس کو استعمال کرنا ممکن ہی نہ ہو، جب کہ قتال کے جواب میں قتال ہی واحد ممکن انتخاب کی صورت اختیار کر لے۔

اس معاملہ میں حضرت عائشہ کی ایک روایت ہمارے لیے رہنما اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے کہا: **ما خير رسول الله صلى الله عليه وسلم بين أمرين إلا اختار أيسرهما** (صحیح البخاری، کتاب الأدب) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو چیزوں میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان کا انتخاب کرتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب کسی معاملہ میں دو امکانی انتخاب ہوتا، ایک آسان انتخاب (easier option) اور دوسرا مشکل انتخاب (harder option) تو آپ ہمیشہ مشکل انتخاب کو چھوڑ دیتے اور جو آسان ہوتا اس کو اختیار فرما لیتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کا تعلق زندگی کے صرف عام معاملات سے نہ تھا بلکہ جنگ جیسے سنگین معاملہ سے بھی تھا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے مشکل انتخاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ نے کبھی خود اپنی طرف سے جنگ کا اقدام نہیں کیا۔ اور جب آپ کے مخالفین کی طرف سے آپ کو جنگ میں الجھانے کی کوشش کی گئی تو آپ نے ہمیشہ اعراض کی کوئی تدبیر اختیار کر کے جنگ کو ٹالنے کی کوشش کی۔ آپ صرف اُس وقت جنگ میں شریک ہوئے جب کہ دوسرا کوئی راستہ سرے سے باقی ہی نہ رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق، اسلام میں

جارحانہ جنگ نہیں ہے، اسلام میں صرف مدافعانہ جنگ ہے اور وہ بھی صرف اس وقت جب کہ اس سے بچنا سرے سے ممکن ہی نہ رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی میں ہمیشہ دو میں سے ایک کے انتخاب کا مسئلہ رہتا ہے ـــــ پُر امن جدوجہد، اور پُر تشدد جدوجہد۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ نے ہمیشہ اور ہر معاملہ میں یہی کیا کہ پُر تشدد طریق کار کو چھوڑ کر پُر امن طریق کار کو اختیار فرمایا۔ آپ کی پوری زندگی اسی اصول کا ایک کامیاب عملی نمونہ ہے۔ یہاں اس نوعیت کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ پیغمبری ملنے کے بعد فوراً ہی آپ کے سامنے یہ سوال تھا کہ آپ مذکورہ دونوں طریقوں میں سے کس طریقہ کو اختیار کریں۔ جیسا کہ معلوم ہے، پیغمبر کی حیثیت سے آپ کا مشن یہ تھا کہ شرک کو ختم کریں اور توحید کو قائم فرمائیں۔ مکہ میں کعبۃ اللہ اسی توحید کے مرکز کے طور پر بنایا گیا تھا مگر آپ کی بعثت کے وقت کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھ دیئے گئے تھے۔ اس لحاظ سے بظاہر یہ ہونا چاہیے تھا کہ قرآن میں سب سے پہلے اس طرح کی کوئی آیت اترتی کہ: **طهر الكعبة من الأصنام** (کعبہ کو بتوں سے پاک کرو) اور اس کو دوبارہ مرکز توحید بنا کر اپنے مشن کو آگے بڑھاؤ۔

مگر کام کا یہ آغاز قریش سے جنگ کرنے کے ہم معنیٰ تھا، جن کی قیادت عرب میں اسی لیے قائم تھی کہ وہ کعبہ کے متولی بنے ہوئے تھے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کعبہ کی عملی تطہیر کے معاملہ سے مکمل طور پر احتراز فرمایا اور اپنے آپ کو صرف توحید کی نظری دعوت تک محدود رکھا۔ یہ گویا پُر تشدد طریق کار کے مقابلہ میں پُر امن طریقِ کار کی پہلی پیغمبرانہ مثال تھی۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی پُر امن اصول پر قائم رہتے ہوئے تیرہ سال تک مکہ میں اپنا کام کرتے رہے۔ مگر اس کے باوجود قریش آپ کے دشمن بن گئے۔ یہاں تک کہ ان کے سرداروں نے باہمی مشورہ سے یہ طے کیا کہ سب مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے تلواروں سے مسلح ہو کر آپ کے گھر کو گھیر لیا۔

یہ گویا رسول اور اصحاب رسول کے لیے جنگ کا کھلا چیلنج تھا۔ مگر آپ نے اللہ کی رہنمائی کے

تحت یہ فیصلہ فرمایا کہ جنگی مقابلہ سے اعراض کریں۔ چنانچہ آپ رات کے سناٹے میں مکہ سے نکلے اور خاموشی کے ساتھ سفر کرتے ہوئے مدینہ پہنچ گئے۔ اس واقعہ کو اسلام کی تاریخ میں ہجرت کہا جاتا ہے۔ ہجرت واضح طور پر پُر تشدد طریقِ کار کے مقابلہ میں پُر امن طریقِ کار کو اختیار کرنے کی ایک مثال ہے۔

۳۔ غزوۂ خندق یا غزوۂ احزاب بھی اسی سنت کی ایک مثال ہے۔ اس موقع پر مختلف قبائل کے لوگ بہت بڑی تعداد میں جمع ہو کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ واضح طور پر آپ کے مخالفین کی طرف سے ایک جنگی چیلنج تھا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ سے بچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ رات دن کی محنت سے اپنے اور مخالفین کے درمیان ایک لمبی خندق کھود دی۔ اس وقت کے حالات میں یہ خندق گویا ایک حاجزہ یا ٹکر روک طریقہ (buffer) تھا۔ چنانچہ قریش کا لشکر خندق کے دوسری طرف کچھ دن ٹھہرا رہا اور اس کے بعد واپس چلا گیا۔ یہ خندق بھی گویا پُر تشدد عمل کے مقابلہ میں پُر امن عمل کا انتخاب لینے کی ایک مثال ہے۔

۴۔ اسی طرح صلح حدیبیہ بھی اسی قسم کی ایک سنت کی حیثیت رکھتی ہے۔ حدیبیہ کے موقع پر یہ صورت تھی کہ رسول اور اصحاب رسول مکہ میں داخل ہو کر عمرہ کرنا چاہتے تھے۔ مگر مکہ کے سرداروں نے حدیبیہ کے مقام پر آپ کو روک دیا اور کہا کہ آپ لوگ مدینہ واپس جائیں۔ ہم کسی قیمت پر آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ یہ گویا قریش کی طرف سے آپ کے لیے ایک جنگی چیلنج تھا۔ اگر آپ اپنے ارادہ کے مطابق عمرہ کرنے کے لیے مکہ کی طرف بڑھیں تو یقینی تھا کہ قریش سے جنگی ٹکراؤ پیش آئے گا۔ مگر آپ نے حدیبیہ پر اپنا سفر ختم کر دیا اور قریش کی یک طرفہ شرطوں پر امن کا معاہدہ کر کے مدینہ واپس آ گئے۔ یہ بھی واضح طور پر تشدد کے مقابلہ میں امن کا طریقہ اختیار کرنے کی ایک پیغمبرانہ مثال ہے۔

۵۔ فتح مکہ کے واقعہ سے بھی آپ کی یہی سنت ثابت ہوتی ہے۔ اس وقت آپ کے پاس جاں نثار صحابہ دس ہزار کی تعداد میں موجود تھے۔ وہ یقینی طور پر قریش سے کامیاب لڑائی لڑ سکتے تھے۔ مگر رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال طاقت کے بجائے مظاہرۂ طاقت کا طریقہ اختیار فرمایا۔ آپ نے ایسا نہیں کیا کہ دس ہزار افراد کی اس فوج کو لے کر اعلان کے ساتھ نکلیں اور قریش سے جنگی تصادم کر کے مکہ پر قبضہ حاصل کریں۔ اس کے بجائے آپ نے یہ کیا کہ کامل رازداری کے ساتھ سفر کی تیاری کی اور اپنے اصحاب کے ساتھ سفر کرتے ہوئے نہایت خاموشی کے ساتھ مکہ میں داخل ہو گئے۔ آپ کا یہ داخلہ اتنا اچانک تھا کہ قریش آپ کے خلاف کوئی تیاری نہ کر سکے اور مکہ کسی خونی تصادم کے بغیر فتح ہو گیا ـــــ یہ بھی پُر تشدد طریقِ کار کے مقابلہ میں پُر امن طریق کار کو اختیار کرنے کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ ان چند مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف عام حالات میں بلکہ انتہائی ہنگامی حالات میں بھی رسول اللہ ﷺ نے جنگ کے مقابلہ میں امن کے اصول کو اختیار فرمایا۔ آپ کی تمام کامیابیاں اسی سنتِ امن کی عملی مثالیں ہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، اسلام میں امن کی حیثیت حکم عام کی ہے اور جنگ کی حیثیت صرف مجبورانہ استثناء کی۔ اس حقیقت کو سامنے رکھئے اور پھر یہ دیکھئے کہ موجودہ زمانہ میں صورت حال کیا ہے۔ اس معاملہ میں جدید دور قدیم دور سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ قدیم زمانہ میں پُر تشدد طریقِ کار ایک عام رواج کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور امن کا طریقہ اختیار کرنا بے حد مشکل کام تھا۔ مگر اب صورت حال یکسر طور پر بدل گئی ہے۔ موجودہ زمانہ میں پُر تشدد طریقِ کار آخری حد تک غیر مطلوب اور غیر محمود بن چکا ہے۔ اس کے مقابلہ میں پُر امن طریقِ کار کو واحد پسندیدہ طریقِ کار کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ مزید یہ کہ موجودہ زمانہ میں پُر امن طریقِ کار کو ایسی فکری اور عملی تائیدات حاصل ہو گئی ہیں جنھوں نے پُر امن طریقِ کار کو بذاتِ خود ایک انتہائی طاقتور طریقِ کار کی حیثیت دے دی ہے۔

ان جدید تائیدات میں بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ مثلاً اظہار رائے کی آزادی کا حق، جدید کمیونیکیشن کے ذریعہ اپنی بات کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کے امکانات، میڈیا کی طاقت کو اپنے حق میں استعمال کرنا، وغیرہ۔ ان جدید تبدیلیوں نے پُر امن طریقِ کار کو بیک وقت مقبول طریق کار بھی بنا دیا ہے اور اسی کے ساتھ زیادہ مؤثر طریق کار بھی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ جب پُر امن طریق کار عملاً دستیاب (available) ہو تو اسلامی جدوجہد میں صرف اسی کو اختیار کیا جائے گا، اور پُر تشدد جدوجہد کو ترک کر دیا جائے گا۔ اب موجودہ صورت حال یہ ہے کہ زمانی تبدیلیوں کے نتیجہ میں پُر امن طریقِ کار نہ صرف مستقل طور پر دستیاب ہے، بلکہ مختلف تائیدی عوامل (supporting factors) کی بنا پر وہ بہت زیادہ مؤثر حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ یہ کہنا بلا مبالغہ درست ہوگا کہ موجودہ زمانہ میں پُر تشدد طریق کار مشکل ہونے کے ساتھ عملاً بالکل غیر مفید ہے، اس کے مقابلے میں پُر امن طریق کار آسان ہونے کے ساتھ انتہائی مؤثر اور نتیجہ خیز ہے۔ اب پُر امن طریقِ کار کی حیثیت دو امکانی انتخابات (possible options) میں سے صرف ایک انتخاب کی نہیں ہے بلکہ وہی واحد ممکن اور نتیجہ خیز انتخاب ہے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ اب پر تشدد طریقِ کار عملاً متروک قرار پا چکا ہے، یعنی وہی چیز جس کو شرعی زبان میں منسوخ کہا جاتا ہے۔ اب اہل اسلام کے لیے عملی طور پر ایک ہی طریقِ کار کا انتخاب باقی رہ گیا ہے، اور وہ بلاشبہہ پُر امن طریقِ کار ہے، اِلّا یہ کہ صورتِ حال میں ایسی تبدیلی پیدا ہو جو دوبارہ حکم کو بدل دے۔

یہ صحیح ہے کہ پچھلے زمانہ میں بعض اوقات پُر تشدد طریقِ کار کو اختیار کیا گیا مگر اس کی حیثیت زمانی اسباب کی بنا پر صرف ایک مجبورانہ انتخاب کی تھی۔ اب جب کہ زمانی تبدیلیوں کے نتیجہ میں یہ مجبوری باقی نہیں رہی تو پُر تشدد طریقِ کار کو اختیار کرنا بھی غیر ضروری اور غیر مسنون قرار پا گیا۔ اب نئے حالات میں صرف پُر امن طریقِ کار کا انتخاب کیا جائے گا۔ جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے، جہاد کے معاملہ میں امن کی حیثیت عموم کی ہے، اور جنگ کی حیثیت صرف ایک نادر الوقوع استثناء کی۔

موجودہ زمانہ میں اس معاملہ کی ایک سبق آموز مثال ہندستانی لیڈر مہاتما گاندھی (وفات ۱۹۴۸) کی زندگی میں ملتی ہے۔ اسی زمانی تبدیلی کی بنا پر مہاتما گاندھی کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ ہندستان میں ایک مکمل قسم کی سیاسی لڑائی لڑیں اور اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچائیں۔ اور یہ سب کچھ شروع سے آخر تک عدم تشدد کا طریقہ (non-violent method) اور پُر امن عمل (peaceful activism) کے اصول کو اختیار کر کے انجام پایا۔

فقہ کا یہ ایک معلوم اصول ہے کہ: تتغیر الأحکام بتغیر الزمان والمکان (زمان اور مکان کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں) اس مسلّمہ فقہی اصول کا تقاضا ہے کہ جب زمانی حالات بدل چکے ہوں تو شرعی احکام کا ازسرنو انطباق (re-application) تلاش کیا جائے، تاکہ شرعی حکم کو زمانی حالات سے ہم آہنگ کیا جاسکے۔ اس فقہی اصول کا تعلق جس طرح دوسرے معاملات سے ہے اسی طرح یقینی طور پر اس کا تعلق جنگ کے معاملہ سے بھی ہے۔ اس اصول کا بھی یہ تقاضا ہے کہ پُر تشدد طریقِ کار کو اب عملاً متروک قرار دیا جائے اور صرف پُر امن طریقِ کار کو شرعی جواز کا درجہ دیا جائے۔

موجودہ زمانہ کی جہادی تحریکیں

موجودہ زمانہ میں اسلامی جہاد کے نام سے بہت سے ملکوں کے مسلمان مسلّح جہاد کی تحریکیں چلا رہے ہیں۔ مگر کوئی تحریک محض اس بنا پر جہاد کی تحریک نہیں ہوسکتی کہ اس کے عَلَم برداروں نے اس کو جہاد کا نام دے دیا ہو۔ کوئی عمل صرف اس وقت اسلامی جہاد قرار پاتا ہے جب کہ وہ اسلام کی مقرر کی ہوئی شرطوں پر پورا اترے۔ جہاد کی شرطوں کی تکمیل کے بغیر جو جہاد کیا جائے وہ عملاً جہاد نہیں ہوگا بلکہ فساد ہوگا۔ جو لوگ اس کام میں مشغول ہوں وہ اپنے اس کام پر جہاد کا انعام نہیں پائیں گے بلکہ اللہ کی طرف سے وہ صرف سزا کے مستحق ہوں گے۔

جہاد بمعنیٰ قتال کی شرطیں کیا کیا ہیں، اس کو میں اپنی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں۔ یہاں صرف ایک بات کا اظہار کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ جہاد بمعنیٰ قتال کی حیثیت نماز روزہ جیسے انفرادی عمل کی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسا عمل ہے جس کا تعلق مکمل طور پر ریاست سے ہے۔

جہاد (بمعنیٰ قتال) کی یہ اصولی حیثیت قرآن وحدیث کی مختلف نصوص سے واضح طور پر معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ دشمن کی طرف سے خوف کی صورت پیدا ہو تو اس کو لے کر خود سے اس کے خلاف کارروائی شروع نہ کردو بلکہ اس کو اولوالأمر (ارباب حکومت) کی طرف لوٹاؤ، تاکہ وہ معاملہ کی صحیح نوعیت کو سمجھیں اور اس کے بارہ میں صحیح اور ضروری اقدام کریں (النساء ۸۳)۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ خوف (جنگی صورت حال) پیش آنے کی صورت میں عوام کے لیے خود سے اقدام کرنا جائز

نہیں۔ وہ صرف یہ کر سکتے ہیں کہ معاملہ کو حاکم کے حوالہ کر دیں اور حاکم کی طرف سے جو اقدام کیا جائے اس میں اس کا ساتھ دیں۔

اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ: **انما الامام جنة، یقاتل من ورائه و یتقی به (صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب یقاتل من وراء الإمام،ویتقی به)** یعنی بلاشبہہ امام ڈھال ہے، قتال اس کی ماتحتی میں کیا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ حفاظت حاصل کی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنگی دفاع ہمیشہ حاکم کی قیادت میں کیا جائے گا۔ عام مسلمانوں کا فرض صرف یہ ہوگا کہ وہ اپنے حاکم کی اتباع کریں اور اس کا ساتھ دے کر حکومت کے منصوبہ کو کامیاب بنائیں۔

فقہ میں یہ مسئلہ ایک متفق علیہ مسئلہ ہے جس میں غالباً کسی قابلِ ذکر عالم کا اختلاف نہیں۔ چنانچہ فقہاء کے متفقہ مسلک کے مطابق، جنگ کا اعلان صرف ایک قائم شدہ حکومت ہی کر سکتی ہے، غیر حکومتی عوام کو اس قسم کا اعلان کرنے کا حق نہیں۔ اسی لیے فقہ میں یہ مسئلہ ہے کہ: **الرحیل للإمام** (جنگ کا اعلان کرنا صرف حاکم وقت کا کام ہے)۔

اصل یہ ہے کہ جنگ ایک انتہائی منظم عمل کا نام ہے۔ اس قسم کا منظم عمل صرف بااختیار حکومت ہی کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگی اقدام صرف حکومت کے لیے جائز ہے، عوام کے لیے جنگی اقدام کرنا سرے سے جائز ہی نہیں۔

موجودہ زمانہ میں مختلف مقامات پر مسلمان جہاد کے نام پر حکومتوں سے پُرتشدد ٹکراؤ چھیڑے ہوئے ہیں۔ مگر تقریباً بلا استثناء ان میں سے ہر ایک کی حیثیت فساد کی ہے نہ کہ اسلامی جہاد کی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اُن میں سے کوئی بھی ''جہاد'' کسی حکومت کی طرف سے جاری نہیں کیا گیا ہے۔

آج کل کی زبان میں ان میں سے ہر ایک جہاد غیر حکومتی تنظیموں (NGOs) کی طرف سے شروع کیا گیا اور انہی کی طرف سے ان کو چلایا جا رہا ہے۔ اگر ان میں سے کسی جہادی سرگرمی کو بالفرض کسی مسلم حکومت کا تعاون حاصل ہے تو یہ تعاون بلا اعلان صرف خفیہ انداز میں کیا جا رہا ہے، اور

شریعت کے مطابق کسی مسلم حکومت کو بھی جہاد کا حق صرف اس وقت ہے جب کہ وہ باقاعدہ طور پر اس کا اعلان کرے (الأنفال ۵۸)۔ اعلان کے بغیر کسی مسلم حکومت کے لیے بھی قتال کرنا جائز نہیں۔

موجودہ زمانہ میں مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی طرف سے جہاد کے نام پر جو سرگرمیاں جاری ہیں، آج کل کی زبان میں وہ دو قسم کی ہیں۔ یا تو اس کی حیثیت گوریلا وار (guerrilla war) کی ہے، یا پراکسی وار (proxy war) کی۔ اور یہ دونوں ہی قسم کی جنگیں یقینی طور پر اسلام میں ناجائز ہیں۔ گوریلا وار اس لیے ناجائز ہے کہ وہ غیر حکومتی تنظیموں کی طرف سے چلائی جاتی ہے نہ کہ کسی قائم شدہ حکومت کی طرف سے۔ اور پراکسی وار اس لیے ناجائز ہے کہ کوئی حکومت اس کو بلا اعلان جاری کرواتی ہے، اور اعلان کے بغیر جنگ اسلام میں جائز نہیں۔

خلاصۂ بحث

اسلامی جہاد ایک مثبت اور مسلسل عمل ہے۔ وہ مومن کی پوری زندگی میں برابر جاری رہتا ہے۔ اس مجاہدانہ عمل کے تین بڑے شعبے ہیں۔

۱۔ جہاد نفس۔ یعنی اپنے منفی جذبات اور اپنے اندر کی نامطلوب خواہشات پر کنٹرول کرنا اور ہر حال میں اللہ کی پسندیدہ زندگی پر جمے رہنا۔

۲۔ جہاد دعوت۔ یعنی اللہ کے پیغام کو تمام بندوں تک پہنچانا اور اس کے لئے یک طرفہ ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ بھرپور کوشش کرنا۔ یہ ایک عظیم کام ہے، اس لئے اس کو قرآن میں جہاد کبیر کہا گیا ہے۔

۳۔ جہاد اعداء۔ یعنی دین حق کے مخالفوں کا سامنا کرنا اور دین کو ہر حال میں محفوظ اور قائم رکھنا۔ یہ جہاد پہلے بھی اصلاً ایک پرامن عمل تھا۔ اور اب بھی وہ اصلاً ایک پرامن عمل ہے۔ اس اعتبار سے جہاد ایک پرامن جدوجہد ہے نہ کہ حقیقۃً کوئی مسلّح کارروائی۔

سوال

میرے ایک عزیز نے مجھے تین سو صفحہ کی ایک کتاب دی۔ اس کا نام نمازِ نبوی ہے۔ اس کتاب کے ٹائٹل پر یہ حدیث لکھی ہوئی ہے کہ: اُس طرح نماز پڑھو جس طرح تم مجھ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔ جن صاحب نے مجھ کو یہ کتاب دی انہوں نے کہا کہ عرب میں زیادہ تر لوگ اسی طرح نماز پڑھتے ہیں۔ اس کتاب کے مطابق، مرد و عورت کے نماز پڑھنے کے طریقہ میں کوئی فرق نہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ہر رکعت کے شروع میں رکوع اور سجدہ سے پہلے ''رفع یدین'' (دونوں ہاتھ کندھوں اور کانوں تک اٹھانا) کرنا ہے۔ عشاء کی وتر کی تیسری رکعت میں دعاء قنوت کی جگہ ایک اور دعا کا پڑھنا ہے۔ اس طرح کے کئی طریقوں پر زور دیا گیا ہے جو ہم لوگوں کی نماز سے الگ ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس کتاب میں بتایا ہوا طریقہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ ہے اور کیا مجھ کو اپنے موجودہ حنفی طریقہ کو چھوڑ کر اس کتاب میں بتائے ہوئے طریقہ پر نماز پڑھنا چاہئے۔ (صوفیہ حیدر، بتیا، بہار)

جواب

یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: **صلوا کما رأیتمونی أصلی** (اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم مجھ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو)۔ مگر رسول اللہصلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات عمومی مفہوم میں ہے نہ کہ کلی مفہوم میں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بنیادی ادائیگی کے اعتبار سے تم لوگ میرے طریقہ پر نماز پڑھو۔ جہاں تک جزئی پہلوؤں کا تعلق ہے، وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمکے یہاں مختلف ہے۔ اس لیے آپ کے اس قول کو کلی مفہوم میں لینا ممکن ہی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح نماز پڑھتے تھے، اس کو معلوم کرنے کا ذریعہ آپ کے اصحاب کی روایتیں ہیں۔ اصحاب رسول کی یہ روایتیں حدیث کی مستند کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ ان روایتوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اصحابِ رسول نے آپ کی نماز کے جو طریقے بتائے ہیں وہ سب کے سب یکساں نہیں ہیں، بلکہ ان میں بہت سے فرق ہیں۔

ان روایتوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ نماز کے کچھ اجزاء کے بارے میں تمام صحابہ متفق الرائے ہیں۔ مثلاً فجر کی دو رکعت، ظہر کی چار رکعت اور مغرب کی تین رکعت۔ اسی طرح ہر رکعت میں رکوع ایک بار اور سجدہ دو بار۔ یہ اجزاء وہ ہیں جن میں کسی بھی صحابی کا کوئی اختلاف منقول نہیں۔ مگر نماز کے کچھ اور اجزاء ہیں جن میں خود صحابہ کی روایتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً کسی روایت سے آمین بالجہر کا ثبوت ملتا ہے تو کسی روایت سے آمین بالسر کا۔ کسی روایت میں رکوع اور سجدہ کے لیے ایک ذکر ہے تو دوسری روایت میں دوسرا ذکر، وغیرہ۔

آپ نے مذکورہ کتاب میں رسول اللہ کی نماز کا جو طریقہ پڑھا، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حدیث کی کتابوں میں صرف اسی طریقہ کا تذکرہ ہے جو اس کتاب میں درج ہے۔ ''نماز نبوی'' کی یہ تصویر انتخابی طور پر بنائی گئی ہے نہ کہ کلی طور پر۔ یعنی کچھ روایتوں کو لے کر کہہ دیا گیا کہ یہ نماز نبوی ہے اور اس کے برعکس دوسری روایتوں کو یا تو لیا نہیں گیا یا یہ کہہ دیا گیا کہ وہ یا تو منسوخ ہیں یا مرجوح ہیں یا غیر افضل ہیں۔ ترجیح کا یہی خود ساختہ اصول حنفی لوگ بھی استعمال کرتے ہیں اور غیر حنفی لوگ بھی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کتب حدیث کی جن روایتوں کو منسوخ یا مرجوح یا غیر افضل قرار دیا جاتا ہے، ان کی اس نوعیت کا علم کہاں سے ہوا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خود روایت کے متن سے ان کی یہ نوعیت ثابت نہیں ہوتی۔ یہ دعویٰ تمام تر فقہاء کے اپنے قیاس پر مبنی ہے، اور عبادت کے معاملہ میں قیاس قابل اعتبار نہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، یہ قیاسی فقہ تبع تابعین کے دور میں پیدا ہوئی۔ اس سے پہلے صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں نماز نبوی کی انتخابی تصویر کا طریقہ رائج ہی نہ تھا۔ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں بھی طریق نماز میں یہ اختلافات عملاً موجود تھے۔ مگر وہ لوگ یہ نہیں کرتے تھے کہ مختلف طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ کو درست قرار دینے کی کوشش کریں، بلکہ ان کا کہنا یہ تھا کہ مختلف صحابہ میں سے جس صحابی کے طریقہ کی بھی تم پیروی کرو گے تم ہدایت پر ہو گے اور تمہاری نماز درست نماز قرار پائے گی۔

اصل یہ ہے کہ ظاہری اعتبار سے نماز کے دو حصے ہیں۔ ان میں سے ایک کو ارکانِ نماز اور

دوسرے کو آدابِ نماز کہا جاسکتا ہے۔ارکان سے مراد نماز کے وہ اجزاء ہیں جن میں تمام صحابہ متفق ہیں اور جن میں تمام صحابہ کی روایتیں ایک ہی تصویر پیش کرتی ہیں۔اس کے مقابلہ میں آداب سے مراد نماز کے وہ جزئی پہلو ہیں جن میں صحابہ کی روایتوں میں فرق واختلاف پایا جاتا ہے۔اس صورت حال کی صحیح توجیہ یہ ہے کہ ارکانِ نماز میں توحّد (یکسانیت) مطوب ہے اور آداب نماز میں تنوع۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، لوگ یہ کرتے ہیں کہ وہ مختلف روایتوں میں سے کچھ روایتوں کو چھوڑتے ہیں اور کچھ روایتوں کو لیتے ہیں اور پھر اپنی منتخب روایتوں کی بنیاد پر ایک تصویر بنا کر کہتے ہیں کہ یہ نماز نبوی (صلاۃ النبی) ہے۔ان لوگوں سے کہا جائے کہ جن ثابت شدہ روایتوں کو آپ نے چھوڑا ہے وہ بھی تو آخر نمازِ نبوی ہی کا حصہ ہیں۔اس کے جواب میں وہ یہ کہیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمنے بیان جواز کے لئے ایسا کیا۔مگر ''بیان جواز'' کا یہ نظریہ قیاسی ہے۔سوال یہ ہے کہ جب نماز کا کوئی ایک واحد معین طریقہ مطلوب تھا تو اس کی کیا ضرورت تھی کہ ''بیان جواز'' کے لئے ایک مختلف طریقہ کا نمونہ قائم کیا جائے۔وہ چیزیں جو ارکان نماز کی حیثیت رکھتی ہیں وہاں آپ نے بیان جواز کی خاطر کبھی کوئی فرق نہیں کیا۔پھر بیان جواز کا جو اصول ارکانِ نماز میں غیر مطلوب تھا وہ آداب نماز میں کیوں مطلوب ہو گیا۔

اس معاملہ کی نوعیت امام شافعی کے قول سے بہت اچھی طرح واضح ہوتی ہے۔۔اگر چہ خود بھی انہوں نے انتخابی اصول کو استعمال کرتے ہوئے نمازِ نبوی کی ایک تصویر بنائی۔مگر اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ: **رأیی صواب یحتمل الخطاء و رأی غیری خطاء یحتمل الصواب** (میری رائے درست ہے احتمالِ خطا کے ساتھ، اور میرے علاوہ کی رائے غلط ہے احتمالِ صحت کے ساتھ)۔

انتخابی تصویر بنانے کی ساری کوشش کے بعد بھی کیا وجہ ہے کہ دونوں فریقوں کے حق میں صرف احتمال خطا یا احتمال صواب ہی حاصل ہوتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک فریق جب کچھ منتخب روایتوں کو لے کر اپنی تصویر مکمل کرتا ہے تو اُس کے بعد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ میری تصویر کے علاوہ بھی بہت سی

مختلف روایتیں حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں جن کو رد کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں تطبیق کا صحیح فارمولا وہ نہیں ہے جو امام شافعی نے اپنے مذکورہ قول میں پیش کیا۔ اس کے بجائے تطبیق کا صحیح فارمولا یہ ہے کہ آداب نماز میں فرق واختلاف کے معاملہ کو تنوع (diversity) پر محمول کیا جائے۔ یعنی یہ بھی ٹھیک ہے اور وہ بھی ٹھیک۔

آخری بات یہ کہ آداب نماز کے معاملہ میں روایتوں کا اختلاف کوئی نقص کی بات نہیں بلکہ وہ عین مطلوب ہے۔ نماز کوئی مشینی عمل نہیں، وہ کیفیت کے ساتھ ادا کیا جانے والا ایک روحانی عمل ہے۔ مشینی عمل میں کلی یکسانیت ہوسکتی ہے مگر کیفی عمل میں کلی یکسانیت ممکن نہیں۔ کیفی عمل میں بنیادی ارکان کے اعتبار سے تو ضرور یکسانیت ہوگی مگر اس کے جزئی پہلوؤں میں فطری طور پر کچھ نہ کچھ فرق ہوجائے گا اور یہ فرق عبادت گذار کی داخلی کیفیت کی بنا پر ہوگا۔

داخلی کیفیت کے اعتبار سے نماز کے جزئی پہلوؤں میں فرق ہونا خود احادیث سے ثابت ہے۔ مثال کے طور پر ایک صحابی کا رکوع سے اٹھنے کے بعد خلاف معمول طور پر یہ کہہ اٹھنا: **ربنا لک الحمد حمداً کثیراً طیباً مبارکا فیه**، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کی تصدیق فرمانا، وغیرہ۔

سوال

غیر مسلم لوگ ہم سے اکثر یہ کہتے ہیں کہ تمہارے مذہب میں باپ کے مرنے کے بعد پوتا حق وراثت سے محروم کر دیا جاتا ہے یہ تو بڑا ظلم ہے۔ اس اعتراض کا کیا جواب ہے۔ (عبدالسلام، ڈھاکہ، بہار)

جواب

محجوب پوتے کی وراثت کا جو مسئلہ فقہ میں ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ محجوب پوتے کو وراثت ہی نہ دو۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وراثتی نقشہ میں درمیانی لنک ٹوٹ جانے کی وجہ سے ایسے پوتے کو ظاہری قانون کے اعتبار سے وراثت نہیں پہنچتی۔ ایسی حالت میں قانونی ڈھانچہ کو برقرار رکھتے ہوئے دوسرے طریقہ سے اس کی تلافی کی جائے۔ تلافی کا یہ طریقہ وصیت کا اصول ہے۔ یعنی جہاں براہ

راست قانونی لنک کے ذریعہ وراثت نہیں پہنچ رہی ہے وہاں دادا اپنے حق وصیت کو استعمال کرتے ہوئے محجوب پوتے کو اس کا واقعی حصہ دے دے۔ چنانچہ اسلام کی پوری تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔

کچھ خاندان ایسے ہو سکتے ہیں جہاں محجوب پوتے کو وراثت نہ دی گئی ہو۔ مگر اس کا سبب سرکشی ہے نہ کہ قانون میں کوئی کمی۔ جن لوگوں کے مزاج میں سرکشی ہو وہ محجوب پوتے کے علاوہ دوسرے مسلّم معاملات میں بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ مثلاً بہنوں کو حق نہ دینا، جس کی مثالیں موجودہ مسلم معاشرہ میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ حالاں کہ یہ شریعت سے انحراف کی بنا پر ہے نہ کہ شریعت کی پیروی کی بنا پر۔

سوال

آپ نے الرسالہ دسمبر ۹۷ء میں ''فطری روش'' کے تحت لکھا ہے کہ عرب جاہلیت کا یہ واقعہ دراصل فطرت انسانی کا واقعہ ہے، اس وقت عرب کے لوگ اپنی فطرت پر قائم تھے۔ اس پر اعتراض یہ ہے کہ اگر عرب کے لوگ فطرت پر قائم ہوتے تو اُن کے دور کو دورِ جاہلیت کے دور سے موسوم کیوں کیا جاتا، اور پیغمبر اسلام کو دین فطرت کی عظمت ان کے دلوں میں بٹھانے میں جنگوں کا سامنا کیوں کرنا پڑتا ـــــ معلوم ہوا کہ وہ لوگ غیر فطری زندگی گزارتے تھے، پیغمبر اسلام کی قربانیوں سے وہ فطری زندگی پر آئے۔ (امیر حمزہ، جامعہ سراج العلوم، کرما)

جواب

اسلام کے مقابلہ میں جب جاہلیت کا لفظ بولا جاتا ہے تو اُس کا مطلب وہ نہیں ہوتا جو اُردو زبان میں اس لفظ کا مستعمل مفہوم ہے۔ بلکہ اس کا مطلب ہوتا ہے، بے خبری (ignorance)۔ اس سے مراد ظہور اسلام سے پہلے کا دور ہے جب کہ اہل عرب وحی اور نبوت سے بے خبر تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جن عربوں (بنو اسماعیل) کے درمیان بھیجے گئے ان کے بارے میں وہ بات خود احادیث سے ثابت ہے جس کا تذکرہ آپ نے الرسالہ میں پڑھا۔ احادیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو خیارِ عرب میں مبعوث فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے اندر اسلام

سے پہلے اعلیٰ انسانی صفات (human qualities) موجود تھیں۔ حدیث کی زبان میں، اسلام نے ان کے اندر فقہ (شعور ایمان) کا اضافہ کیا۔ اس طرح جاہلیت کے بہترین لوگ اسلام میں بہترین لوگ بن گئے (**خیارکم فی الجاهلية خیارکم فی الإسلام إذا فقهوا**)۔

عرب کے یہ لوگ جو اسلام میں آنے کے بعد بہترین امت بن گئے، وہ کسی پُر اسرار قسم کی قربانی کے ذریعہ نہیں بنے۔ بلکہ وہ دعوتی جدوجہد کے ذریعہ بنے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ اور قرآن کے مطالعہ نے ان کے اندر حق کا شعور پیدا کیا۔ ان کے اندر ذہنی بیداری آئی۔ اس طرح انہوں نے معرفت (دریافت) کے طور پر اللہ کے دین کو پایا۔ یہ مکمل طور پر فکری انقلاب (intellectual revolution) کے ذریعہ پیش آنے والا ایک واقعہ تھا نہ کہ کسی پُر اسرار قربانی کے ذریعہ پُر اسرار طور پر پیش آنے والا کوئی واقعہ۔

سوال

آپ کی تحریروں کے ذریعہ میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ دعوت وتبلیغ کا فریضہ کسی بھی اسلامی دور میں متروک نہیں رہا ہے۔ اور آپ کی تحریروں سے بعض لوگوں کے اس استنباط کی بھی تردید ہوتی ہے کہ دعوتی و دینی نقطہ نظر سے امت مسلمہ پر طویل ''قرون مظلمہ'' کا دور گذرا ہے۔ میرے اس خط کا موضوع صوفیائے کرام کی تبلیغی و دعوتی کوشش ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ۱۲۰۰ء کے بعد جب کہ صوفی تحریک کو عالمگیر فروغ حاصل ہوا، کیا اس دور میں بھی صوفیاء کرام نے دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام نہیں دیا ہے، اس ضمن میں میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔ (شکیل احمد فاروقی، مہاراشٹر)

جواب

یہ بات صحیح ہے کہ حضرات صوفیاء نے براہ راست طور پر دعوتی کام نہیں کیا۔ یعنی وہ ایسا نہیں کرتے تھے کہ غیر مسلموں کے پاس جا کر کہیں کہ: **ایها الناس قولوا لا اله الا الله تفلحوا**۔ صوفیاء کا جو کارنامہ ہے اس کو معاونِ دعوت کارنامہ کہا جا سکتا ہے نہ کہ براہ راست دعوت وتبلیغ کا کارنامہ۔

اصل یہ ہے کہ دور اول کے بعد اسلام عالمی طور پر ایک معروف دین بن گیا تھا۔ مزید یہ کہ اپنی

فطری سادگی کی بنا پر اس کے اندر ہر انسان کے لیے کشش تھی۔ اس طرح اسلام کے اندر اپنے آپ لوگوں کے دلوں میں نفوذ کرنے کی طاقت پیدا ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی اشاعت ایک عمل (process) کے روپ میں خود اپنے زور پر مسلسل ہونے لگی۔ دور اول کی بعد کی تاریخ میں اسلام اسی طرح اپنے آپ پھیلتا رہا۔

صوفیاء کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے وہ منفی کام نہیں کیا جو موجودہ زمانہ کے نادان مسلم لیڈروں نے کیا۔ ان لیڈروں نے قومی تحریکیں چلا کر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مصنوعی طور پر تناؤ کا ماحول پیدا کر دیا۔ اور اس طرح داعی اور مدعو کے درمیان نفرت پیدا کر کے اسلام کے اشاعتی عمل میں رکاوٹ ڈال دی۔ صوفیاء نے اپنے آپ کو اس قسم کے منفی عمل سے مکمل طور پر بچایا۔ انہوں نے اپنے مخصوص طریقہ کے ذریعہ مختلف فرقوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کی فضا قائم کی۔ اس طرح معتدل اور خوشگوار تعلقات کے درمیان جب مسلمانوں اور غیر مسلموں کا اختلاط بڑھا تو اپنے آپ اسلام بھی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا۔ صوفیاء کی براہ راست تبلیغ کے بغیر لوگ جوق در جوق آ کر صوفیاء کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے لگے۔

مدنی دور میں صلح حدیبیہ کے بعد ہی یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ اسلام کی اشاعت کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں یا داعی اور مدعو کے درمیان کشیدگی نہ ہو اور معتدل فضا میں اختلاط (interaction) ہونے لگے تو اسلام اپنے آپ پھیلنے لگے گا۔ صوفیاء نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی امکان کو استعمال کیا جو بدقسمتی سے کوئی دوسرا مسلم گروہ استعمال نہ کر سکا۔

سوال

اس وقت عالم اسلام جن مسائل سے دوچار ہے ان میں شاید سب سے زیادہ سنگین مسئلہ یہ ہے کہ مختلف مکاتب کے لوگ ایک دوسرے کے خلاف زہر افشانی اور تکفیر تک کرتے رہتے ہیں جو اتحاد بین المسلمین میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ میں خود ایک گروہ سے وابستہ ہوں اور اس کی قدر کرتا ہوں مگر دوسرے کچھ گروہ اس کی تکفیر کرتے ہیں، اس معاملہ میں آپ اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔ (محمد جنید احمد حقانی، اسکاسٹ، کشمیر)

جواب

موجودہ قسم کی تکفیر کا طریقہ جو کچھ مسلمانوں میں رائج ہے، وہ یقیناً غلط ہے۔ یہ ایک بدعت ہے۔ صحابہ کرام کے دور میں اس قسم کی تکفیر کا رواج بالکل نہ تھا اور جس طریقہ کا رواج صحابہ کرام کے یہاں نہ پایا جائے وہ بلاشبہہ قابل رد ہے۔

ایک دوسرے کو کافر قرار دینے کا طریقہ سلطنت عباسی کے دور میں شروع ہوا۔ یہ طریقہ چند سو سال تک جاری رہا۔ اس زمانہ میں لوگوں کو اس سے دلچسپی نہ رہی کہ وہ غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کریں۔ اس کے بجائے وہ اس نامحمود عمل میں مشغول ہو گئے کہ وہ مسلمانوں کو اسلام سے خارج قرار دیں۔ تکفیر کا یہ طریقہ چند سو سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ علماء نے اس سلسلہ کو بند کرنے کے لئے متفقہ طور پر یہ اعلان کیا کہ ہم اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کریں گے۔ (**لانکفر احدا من اھل القبلة**)۔

حقیقت یہ ہے کہ تکفیر و تفسیق کے موجودہ ہنگامہ کا کوئی بھی شرعی جواز نہیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ گویا ایک مذہبی گالی گلوج ہے نہ کہ کوئی مطلوب مذہبی عمل۔

سوال

غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچانا مسلمانوں کی اولین ذمہ داری ہے۔ علماء کرام اور دانشوران اسلام اگر اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ اسلام کا پیغام غیر مسلم حضرات تک حکمت کے ساتھ پہنچائیں تو امید ہے کہ غیر مسلموں کی ایک کثیر تعداد اسلام کے بارے میں اپنے دل میں نرم گوشہ رکھے گی اور قرآن پاک جیسی کتاب کو جلانے کے بجائے اسے سینے سے لگائے گی اور اس کا مطالعہ کرے گی تو قبولیت اسلام کے لئے بھی تیار ہو جائے گی۔ مگر اس معاملہ میں اس قدر کوتاہی برتی جارہی ہے کہ جیسے یہ کرنے کا کوئی کام ہی نہیں۔ اس سلسلہ میں کن لوگوں کو کن حکمتوں کے ساتھ یہ کام کرنا چاہئے۔ (شکیل احمد فارمیسسٹ، بھنڈارہ)

جواب

موجودہ زمانہ کے مسلمان جو معمولی معمولی واقعات پر مشتعل ہو کر جلوس نکالتے ہیں اور جلاتے

پھونکتے ہیں وہ ایک جرم ہے نہ کہ کوئی اسلامی خدمت۔ موجودہ مسلمانوں کی یہی منفی ذہنیت اسلام کی توسیع واشاعت میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت کا آغاز انسانی خیرخواہی سے ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی تاجر صرف اس وقت کامیاب تجارت کرسکتا ہے جب کہ وہ اپنے گاہکوں کا خیر خواہ ہو اور ان سے محبت اور رعایت کا تعلق قائم کرے۔ اسی طرح دعوتی عمل کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ داعی کے دل میں اپنے مدعو کے لئے خیرخواہی ہو۔ وہ سارے انسانوں سے محبت کرنے والا ہو نہ کہ صرف اپنی قوم سے محبت کرنے والا۔ یہ حقیقت ہے کہ دعوت کا کام احترام انسانیت کے اصول پر قائم ہوتا ہے، مگر بدقسمتی یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان صرف احترام مسلم سے واقف ہیں، وہ احترام انسان سے واقف نہیں۔ یہی وہ اصل حکمتِ دعوت ہے جس کے زندہ ہونے پر دعوت کا عمل جاری ہوسکتا ہے۔

ایک خط

برادر محترم جسٹس ایم ایم قاضی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ناگپور کا سفر میرے لئے ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ یکم جولائی ۲۰۰۱ کو ناگپور کی انجمن حامئ اسلام کے تحت جو غیر معمولی کامیاب اجتماع ہوا وہ اپنے اندر کئی سبق آموز پہلو رکھتا ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ اجتماع صرف ایک مقرر (راقم الحروف) کے نام پر کیا گیا تھا۔ پھر بھی اتنی بڑی تعداد میں مسلمان اس میں شریک ہوئے کہ ہال کے اندر اور ہال کے باہر کی تمام کرسیاں بھر گئیں۔

عام طور پر پبلک جلسوں میں لوگ زیادہ تعداد میں دو وجہوں سے آتے ہیں۔ یا تو جلسہ کسی برننگ اشو (burning issue) پر کیا گیا ہو، یا اسٹیج پر بہت سے مقرر بیٹھے ہوں جو مختلف طبقوں کے لئے کشش کا باعث ہوسکیں۔ لیکن ناگپور کا مذکورہ جلسہ اس قسم کے کسی عنوان کے بغیر کیا گیا۔ اسی طرح منتظمین نے شخصی نام کے ساتھ صرف یہ اعلان کیا تھا کہ:

Maulana Wahiduddin will address a gathering on Sunday the Ist July 2001 at 10 am in Anjuman Polytechnic Hall, Sadar, Nagpur.

اس کے باوجود شہر کے تعلیم یافتہ مسلمان اتنی بڑی تعداد میں آئے کہ لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ناگپور میں یہاں کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کا اتنا بڑا اجتماع اس سے پہلے شاید کبھی نہیں ہوا۔ یہ واقعہ ہندستانی مسلمانوں کے اندر آنے والی ایک عظیم ذہنی تبدیلی کی علامت ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملک کے مسلمان ہمارے تعمیری پیغام کی طرف تیزی سے راغب ہو رہے ہیں۔ اب وہ دور ختم ہو چکا ہے جو ۱۹۹۲ کے بعد کچھ لوگوں کی طرف سے بے بنیاد پروپیگنڈہ کے نتیجہ میں وقتی طور پر پیش آیا تھا۔

اس واقعہ کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو میں نے اپنی تقریر میں بیان کیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ ہمارے اخباروں میں عام طور پر ناگپور کا تعارف اس حیثیت سے کیا جاتا ہے کہ وہ آر ایس ایس کا سنٹر ہے۔ آر ایس ایس کا یہ سنٹر تو وسیع شہر کے کسی گوشہ میں ایک محدود رقبہ کے اندر واقع ہوگا۔ دوسری طرف

الترمذی اور ابن ماجہ (کتاب الزہد) کی ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **مافی الارض موضع اربع اصابع الا و ملک واضع جبهته ساجداً لِلّٰه**۔ یعنی زمین میں چار انگل جگہ بھی نہیں مگر وہاں ایک فرشتہ اپنی پیشانی رکھے ہوئے، اللہ کے لئے سجدہ کی حالت میں موجود ہے۔

اس حدیث کے مطابق، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہماری زمین پر اللہ کے فرشتے اتنی زیادہ تعداد میں متعین ہیں گویا کہ ہر ۳ انچ پر ایک فرشتہ موجود ہے۔ اور ناگپور بھی بلاشبہہ اسی زمین کا ایک مختصر حصہ ہے۔ پھر جب زمین کے انتظام پر خدا کے فرشتے اتنی زیادہ تعداد میں موجود ہوں تو ہمیں کسی انسانی تنظیم سے ڈرنے کی کیا ضرورت۔

زمین کے ہر چار انگل پر ایک فرشتہ کا حالت سجدہ میں ہونا اقتدار الٰہی کی ایک تعبیر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین پر اللہ نے بہت بڑے پیمانہ پر اپنا کنٹرول قائم کر رکھا ہے۔ یہ کنٹرول اس بات کی ضمانت ہے کہ خدا کی اس زمین پر کوئی ناانصافی مستقل طور پر باقی نہ رہے۔ کوئی دبا ہوا طبقہ ہمیشہ کے لیے دبی ہوئی حالت میں نہ پڑا رہے۔

ناگپور کی تقریر میں میں نے کہا تھا کہ ہندستان کے مسلمان اس ملک کے لئے سرمایہ (asset) ہیں۔ وہ اس ملک کے لئے بوجھ (liability) نہیں ہیں۔ اور یہ براہ راست انتظامِ خداوندی کے تحت ہے۔ اس دنیا میں خود قانون فطرت کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ ایک اقلیت ہمیشہ تخلیقی اقلیت (creative minority) بنتی چلی جاتی ہے اور ہر اکثریت ہمیشہ غیر تخلیقی اکثریت (uncreative majority) بنتی رہتی ہے۔ یہ بات ایک امریکی سروے کے ذریعہ باقاعدہ طور پر ثابت ہو چکی ہے۔ فطرت کا یہ اٹل نظام گویا خالق کی طرف سے اقلیتوں کا ایک مستقل محافظ ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: **کم من فئةٍ قليلةٍ غلبت فئة كثيرةً بإذن الله** (البقرہ ۲۴۹)۔

فطرت کے مذکورہ قانون کی روشنی میں اس آیت کی تشریح کی جائے تو وہ یہ ہوگی کہ خدا کی اس

دنیا میں اگر کوئی گروہ اقلیت میں ہو تو اسے اپنے آپ کو کم سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ ایک فطری عمل (natural process) کے ذریعہ خود بخود ایسا ہوگا کہ اقلیتی گروہ کی صلاحیتیں زیادہ بیدار ہوں گی۔ اس کے مقابلہ میں اکثریتی گروہ کی صلاحیتیں خفتہ رہ جائیں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اکثریتی گروہ کے مقابلہ میں اقلیتی گروہ ہر لحاظ سے زیادہ آگے بڑھ جائے گا۔ اقلیتی گروہ اکثریتی گروہ پر فائق ثابت ہوگا۔ فطرت کا یہ قانون اکثریتی گروہ کے لئے ایک مستقل وارننگ ہے، اور اقلیتی گروہ کے لئے ایک مستقل خوش خبری۔

ناگپور میں مذکورہ قسم کے ایک اجتماع کو دیکھنے کے بعد میرا تاثر یہ تھا کہ جس شہر میں اتنا کامیاب مسلم اجتماع کرنا ممکن ہو وہاں اس قسم کی بات کہنا بھی ناشکری ہے کہ یہاں اینٹی مسلم جماعت کا سنٹر ہے۔ قرآن کے مطابق، اصل اہمیت کی بات یہ نہیں ہے کہ ملک میں کچھ مسلم مخالف لوگ رہتے ہیں۔ اصل اہمیت کی بات یہ ہے کہ حقیقی یا فرضی مخالفین کے باوجود اس ملک کے مسلمان مکمل طور پر آزاد ہیں۔ وہ ہر قسم کی دینی اور ملی سرگرمیاں کسی رکاوٹ کے بغیر انجام دے سکتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ناشکری سے بچیں، اور اللہ کا شکر ادا کریں تاکہ وہ ہمیں اپنی مزید نعمتیں عطا فرمائے (لئن شکرتم لأزیدنکم)۔

شکر کا مطلب اعتراف ہے۔ شکر کا مزاج آدمی کے اندر مثبت نفسیات پیدا کرتا ہے اور وہ منفی نفسیات کو مکمل طور پر ختم کر دیتا ہے۔ اس قسم کا مثبت مزاج جس آدمی کے اندر پیدا ہو جائے، اس کی ذہنی اور عملی ترقی کو کوئی چیز روکنے والی نہیں۔

نئی دہلی، ۶ جولائی ۲۰۰۱ دعا گو وحید الدین